

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224018

UNIVERSAL
LIBRARY

جلد اول ستمبر سنہ ۱۹۲۵ء نمبر



اوزنگ آباد کالج کا دو ماہی رسالہ

انجمن اُردو کے مطبع میں چھپا

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	نورس	آدیتر	۱
۲	شذرات	ایضاً	۵
۳	اخبار علمیہ	ایضاً	۱۷
۴	ہانی بدھہ مت سے خطاب	شیخ چاند متعلم سکندہ اہر عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن	۲۵
۵	نورسوں سے خطاب	مولوی عبدالقدیر صاحب قدیر اہولہ ضلع ناسک	۳۶
۶	خاموش گویائی	سر دار سنگھ طالب علم عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن	۳۸
۷	عادت	محمد ایوب خان معلم سیلہر انٹر میڈیٹ عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن	۴۷
۸	شہر کا نظارہ شب	افضل حسین فاروقی	۵۷
۹	اخبار کلیہ		۶۳

نورس

آج کل اُردو میں رسالے اس کثرت سے نکل رہے ہیں کہ اُن کے لئے نام تجویز کرنا ایسا ہی مشکل ہو گیا ہے جیسے شاعروں کے لئے نئے نئے تخلص کا انتخاب۔ علی گڈہ مسلم یونیورسٹی کی انجمن اُردو کے لئے ایک رسالہ نکالنا چاہتی ہے لیکن نام نہیں ملتا۔ وہاں اچھے اچھے ادیب اور باکمال موجود ہیں لیکن اس نو۔ مولود کے لئے کوئی موزوں نام نہیں سوچھتا۔ دور و نزدیک خط لکھ جا رہے ہیں مگر کوئی دستگیری نہیں کرتا۔ جب مجھے اپنے کالج کی طرف سے رسالہ نکالنے کا خیال ہوا تو نام کی مجھے بھی فکر ہوئی۔ میرے ایک عزیز دوست نے اس کا نام دلرس تجویز کیا۔ اس لئے کہ مقبرۂ رابعہ دورانی جو اورنگ آباد میں ہے اور جہاں میرا قیام ہے مہالک معروسہ سرکار عالی میں سب سے بہتر اسلامی عبارت ہے۔ یہ اورنگ زیب کی چہیتی بیوی کا مقبرہ ہے جن کا نام دلرس بانو تھا۔ اورنگ آباد کی خصوصیت سے یہ نام بہت اچھا

تھا لیکن دُورس کا نام سنتے ہی میرے ذہن میں دُورس کا خیال آیا۔

دُورس کا خیال مجھے کیسے آیا ؟۔ کچھ عرصہ پہلے ایک عجیب اتفاق سے سلطان ابراہیم عادل شاہ کی فایاب کتاب دُورس میرے ہاتھ لگی تھی اور میں اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ یہ اس خیال کا باعث ہوئی۔ ابراہیم عادل شاہ کو بھی یہ لفظ محض اتفاق سے ملا۔ کہتے ہیں کہ جب بادشاہ اپنا نیا شہر تعمیر کر رہے تھے تو ایک روز پاس کے موضع کے لوگ ایک شیشہ شراب کا بطور پیشکش کے بادشاہ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے پی تو بہت ہی لطف و نشاط حاصل ہوا اور فرمایا ”امروز مارا کیفے نورسیدہ“، اس لفظ کا زبان پر آنا تھا کہ انہوں نے اسے فال نیک سمجھا اور نو تعمیر شہر کا نام اُسی وقت دُورس پور رکھ دیا۔ اب اس لفظ سے انہیں ایسا عشق ہوا کہ ہر مقام اور ہر شے پر اس کا استعمال کرنے لگے۔ چنانچہ مہمات مالی و ملکی میں بھی ایک عمل دُورس قرار پایا اور دفتر کے معاملات داد و ستد وغیرہ دُورس کے حساب سے ہونے لگے۔ اپنی خاص مہر پر جو یمنی عقیق کی تھی بجائے اپنے نام کے دُورس کا لفظ کندہ کرایا۔ دُورس نام کا سکھ چلایا۔ علم دُورس اور نشان دُورس بنائے گئے۔ محل

خاص کا نام نورس تجویز ہوا۔ اپنی تالیف کا نام جو فن موسیقی میں ہے نورس رکھا۔ ایک عید نورس قرار پائی جو نویں مہینے جمعہ کو ہوتی تھی اور اس میں بڑے بڑے کلارنت اور صاحب فن جمع ہوتے تھے اور اپنا اپنا کمال دکھاتے تھے۔ بادشاہ کی دیکھا دیکھی امرا و اعیان دولت نے بھی اس لفظ کے استعمال کو باعث فخر سمجھا۔ چنانچہ ظہوری کا دیباچہ نورس مشہور ہے۔ یہ بادشاہ کی مدح میں ہے۔ معتمد قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ کا نام نورس نامہ فرشتہ رکھا۔ اس زمانہ کے ایک شاعر عبدالقادر کا نخلص نورس تھا —

یہ لفظ ایسا سادہ اور خوبصورت ہے کہ اس کے ذہن میں آتے ہی پھر دوسرا کوئی نام نہ جپا اور میں نے رسالہ کا یہی نام تجویز کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک کالج کے رسالے کے لئے جو حال ہی میں قائم ہوا ہے اور ان طلبہ کی مناسبت سے جو اس میں تعلیم پاتے ہیں اس سے موزوں کوئی دوسرا نام نہیں ہو سکتا۔ اس رسالے کو کسی قسم کا دعویٰ نہیں۔ یہ محض طالب علموں کے لئے ہے اور انہیں کی ملک ہے۔ اس کا منشا اُن میں علمی اور ادبی ذوق پیدا کرنا ہے۔ اس لئے ایک خاص حصہ انہیں کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ مختلف علمی معلومات بھی بہم پہنچانے کی کوشش کی گئی

ہے تاکہ ان کا علم صرف درسی کتابوں ہی تک محدود نہ رہے اور اُن میں مطالعہ کا شوق پیدا ہو۔ تعلیم کی ایک بڑی غایت یہ بھی ہے کہ طالب علم اپنے مافی الضمیر کو صحت اور سلیقہ کے ساتھ ظاہر کر سکے۔ اصل میں اس رسالے کی اشاعت کا مقصد اس غایت کی تکمیل ہے۔ اگر ہمارے طالب علموں میں ادبی ذوق پیدا ہو گیا اور اُن کی توجہ انشا پر داری کی طرف ہو گئی تو ہمارا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ یہی زمانہ اُن کے کچھ کر لینے اور حاصل کر لے نہ کا ہے۔ اس وقت کی کوشش اور کاوشیں اُن کی آئندہ زندگی میں بار آور ہونگی۔ یہ وقت بونے اور پرورش کرنے کا ہے۔ اس محنت کا پہل اُس وقت ملے گا جب دنیا کے کارخانے میں قدم رکھیں گے۔ جو ہوئیگا۔

فی الحال اس رسالے کو ہم نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ جب طالب علم اس کی ترتیب وغیرہ کا کام سیکھ جائیں گے تو یہ امانت اُن کے حوالہ کردی جائیگی تاکہ وہ خود ہی ترتیب دیں اور خود اس کے چلانے کا انتظام کریں۔ البتہ جس قسم کی مدد انہیں درکار ہوگی وہی شے سے انہیں دیں گے۔

شذرات

ربع صدی کے بعد آج پھر اورنگ آباد کی پرانی نگری ایک کلیہ کے قیام سے منور نظر آتی ہے۔ وہ زمانہ دوسرا تھا۔ اُس زمانے کے خیالات بھی دوسرے تھے۔ لارڈ میکالے کا بویا ہوا بیج بھل پھول لارہا تھا۔ انگیزی زبان کی گرم بازاری تھی۔ ”گیسوے اردو“ ”منت پذیر شافہ“ تھا اور اسی وجہ سے ہمارا ”اورنگ آباد کالج“ بھی علوم کی نشر و اشاعت کے لئے سات سہندر پار کی زبان کو استعمال کرتا تھا۔ لیکن زمانے نے پلٹا کھایا۔ اردو زبان کی قسمت جس خس و خاشاک کے نیچے دبے ہوئی تھی شاہانہ الطاف کے جھونکوں نے اُسے آزادیا اور سرسوتی نے ایک مدت بعد اپنی زبان کھولی اور اپنی مہابانی سے جو ہندوستان کی چہیتی زبان ہے سر زمین دکن پر موتی برسائے۔

—:O:—

جامعۂ عثمانیہ کیا چیز ہے۔ اس کی اہمیت کیا ہے دارالترجمہ ہماری زبان کی کیا خدمت کر رہا ہے؟ ان سوالات کا جواب ہم آپ نہیں دے سکتے۔ ہم تصویر کے اتنے

نزدیک کھڑے ہوئے ہیں کہ اس کے اصلی حسن اور خوبی کو معلوم نہیں کر سکتے۔ ہاں! آنے والی نسلیں اس کی اصلی اہمیت کو سمجھیں گی اور اُس کے سر پرست اعلیٰ کی پیش بینی کی داد دیں گی۔ آنے والے مورخین حیدرآباد دکن کی طرف اشارہ کریں گے اور بتلائیں گے کہ اسی افق سے ہندوستان میں علم و حکمت کا ایک نیا آفتاب طلوع ہوا تھا۔ اسی زمین سے وہ سوت پھوٹی تھی جس نے بڑھتے بڑھتے ایک اتھا سہندر کی شکل اختیار کر لی جس کی موجوں نے اختلاف زبان کی دیوار کو بات کی بات میں گرا دیا اور ایک متحدہ اور مشترک زبان دے کر جنم بھوم۔ قومیت اور نسل کے امتیاز کے باوجود ایک متحدہ ”قومیت“ پیدا کر دی۔ اُردو جگت بھاشا نہ ہو تو نہ ہو۔ ہندوستان کی قومی زبان ضرور ہوگی اور اُن اجزا کی شیرازہ بندی کرے گی جو اب تک بکھرے ہوئے تھے۔

—————:O:—————

جس آفتاب کی ضیا باریوں نے قلمروے آصفیہ کی حدود سے بڑھ کر پورے ہندوستان کے اندھیرے میں اجالا کر دیا ہو اُس کی شعاعیں دلی اور سراج کے جنم بھوم تک کیوں کر نہ پہونچتیں۔ اگر حیدرآباد فرخندہ

بنیاد تخت آصفی کا سب سے زیادہ چمکدار ہیرا ہے۔ تو اورنگ آباد خجستہ بنیاد اُس کا گوہر تابدار ہے اور تاریخی حیثیت سے اسے اولیت کا فخر حاصل ہے۔ چنانچہ یہاں بھی آبان سنہ ۱۳۳۳ھ میں انٹر میڈیٹ کالج کا قیام عمل میں آیا۔ بڑے ہیرے کی جوت سے یہ چھوٹا سا موتی بھی جگمگا اُٹھا۔

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ
ذره آفتاب تا با فیم

—————:O:—————

جس طرح تعلیم و تربیت تکمیل حیات انسانی کے دو الگ الگ شعبے ہیں اسی طرح ہر ادارہ علمی کے لئے درس و تدریس کے ضابطوں کے علاوہ کچھ ذاتی صفات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اظہار خیال کی قدرت۔ زندگی کے مختلف مسائل سمجھنے کی صلاحیت اور بلند پایہ انسانیت کا نشو و نہا یہ وہ چند صفتیں ہیں جن کا پیدا کرنا ہر تعلیم گاہ کا پہلا فرض ہے۔ اگر زندگی کو فی رنگیوں کی وحدت مان لیا جائے تو اس مجموع کے اجزا کی فرداً فرداً تکمیل کتنی ضروری ہو جاتی ہے۔ ہمارے رسالہ کا اجرا وہ پہلا قدم ہے جو اس تکمیل کی طرف بڑھایا جا رہا ہے۔ نورس میدان صحافت میں کسی دعوے کے ساتھ نہیں

اُترا ہے۔ وہ صرف ایک مقصد کا حامل ہے۔ وہی مقصد جو ہر کلیہ کے رسالے یا میگزین کا ہوتا ہے یعنی طلباء میں ان کی بساط کے موافق علم و تحقیق کی چیتک پیدا کرنا۔ انہیں اس قابل بنانا کہ اپنے کچے پکے خیالات کو اچھے اسلوب کے ساتھ پیش کر سکیں اور اہم اور دلچسپ معلومات حاصل کر سکیں۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر ہم نے اس رسالہ کے برے حصہ کو طلبہ کے مقالات کے لئے وقف کر دیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہماری یہ بھی نیت ہے کہ اس میں دیگر اہل ذوق حضرات کے لئے بھی معلومات و تقریح کا اچھا خاصہ سامان فراہم کیا جائے۔ ان کی سرپرستی ہمیشہ ہمارے لئے باعث فخر رہے گی اور ”فورس کا دامن“ پختہ مغزان عام و فن کے سامنے ہمیشہ پھیلا ہوا رہے گا۔

—: 0 :—

اب تک ہندوستان کی قدیم یونیورسٹیوں میں اُردو اور عام طور پر السنۂ مشرقیہ کی سرپرستی کرنے والی صورتیں یونیورسٹیاں رہی ہیں۔ یعنی پنجاب اور الہ آباد اور مدراس۔ لیکن اب یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ دوسری یونیورسٹیوں کی توجہ بھی اس طرف ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ حال میں بمبئی یونیورسٹی کی مجلس رفقا نے اپنے ہاں شعبہ علوم مشرقی قائم کرنے کی تجویز کو

منظور کیا ہے۔ بہمبئی یونیورسٹی کے طلبہ ایف۔ اے پاس کرنے کے دو سال بعد B. O. L. اور ۴ سال بعد M. O. L. کی ڈگریاں حاصل کرسکیں گے۔ ان ڈگریوں کے لئے جو گروپ قائم کئے گئے ہیں اُن میں عربی۔ فارسی۔ اُردو۔ پہلوی۔ ایک پراکرت۔ سنسکرت۔ ہندی وغیرہ زبانیں داخل ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان علوم کی تعلیم بھی ہندوستانی زبانوں ہی میں دی جائیگی۔ مغرب کی دلداد بہمبئی یونیورسٹی کی اس مشرق پسندی کو عام طور پر علمی حلقوں میں حیرت کی نظروں سے دیکھا جا رہا ہے۔ لیکن ہم کو اس پر مطلق تعجب نہیں ہے۔ جس صوبہ کے پڑوس میں جامعہ عثمانیہ موجود ہو اُس سے تو کہیں زیادہ کی توقعات رکھی جاسکتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ارباب کلکتہ و دوسری یونیورسٹیاں اس ”بدعت“ کی کب مرتکب ہوتی ہیں؟

—:O:—

وسایل آمد رفت کی مدد سے مغربی تہذیب نے جس سرعت کے ساتھ ترقی کی ہے اس کا ایک ادنیٰ نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ یہ سننا تک گوارا نہیں کرتے کہ ان کا تمدن مشرق کا زیر بار احسان ہے۔ چنانچہ ابھی سو سال اوپر یورپ کے علمی حلقوں میں یہ خیال رائج تھا کہ انسان کی ذہنیت کا آغاز ۱۰۰۰ سال ق۔ م یعنی ہومر کے زمانے

سے ہوتا ہے۔ آشوریوں اور فنیقیوں کو وہ لوگ محض وحشی سمجھتے تھے لیکن حال میں جو اکتشافات ہوئے ہیں انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ہومر کی الیڈ سے کئی ہزار سال قبل بھی مصر-شام-عراق اور ہندوستان میں علم کے چرچے رہتے تھے اور جس چراغ سے یونانیوں اور یہودیوں نے اپنی حکمت کا دیا جلایا وہ مشرق کی سبھا میں بہت پہلے سے روشن تھا۔

————— (۱) —————

گزشتہ ماہ میں مستر دولے کو آر میں اور مستر میکے کو کش میں جو آثار دستیاب ہوئے ہیں ان کی عمر ۶۰۰۰ سال کی ہے۔ یعنی ۴۰۰۰ سال ق-م-آر (۱۲) اور کش (Kish) یہ دونوں مقامات عراق میں واقع ہیں۔ ان اکتشافات سے معلوم ہوتا ہے کہ عراق عرب کے سہیرین لوگ عیش و عشرت میں بسر کرتے تھے۔ اُن کے مذہبی خیالات بھی ہمارے زمانے کے خیالات سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے اور اُن میں تجارت بھی تھی۔

————— (۱) —————

ان آثار کے مطالعہ سے ہندوستان کی قدیم تاریخ پر بھی عجیب و غریب روشنی پڑتی ہے۔ ان ہردو حضرات نے جیسی مہریں عراق میں پای ہیں وہ بالکل ویسی ہی ہیں

جو کچھ عرصہ قبل سندھ سے دستیاب ہوئی تھیں۔ تل البعید
میں (جو آر کے نزدیک ہے) نندی کے مجسمے بھی ملے ہیں
جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی گائے کو مقدس اور
”خالق اکبر“ مانا جاتا تھا۔ وہاں کی عمارتوں کا انداز
بالکل وہی ہے جو بعد کی بودھ مت کی عمارتوں میں پایا
جاتا ہے۔ ان اکتشافات نے ثابت کر دیا ہے کہ پرانے زمانے
میں عراق اور ہندوستان کے مابین تجارتی تعلقات تھے
اور ہندوستانی تہذیب نے ان سمیریوں کی تہذیب کا گہرا
اثر قبول کیا ہے۔ خدا معلوم ان کی طرح مشرقی تہذیب کے
کتنے خاموش گواہ ہنوز زیر خاک مدفون ہیں؟

—: 0 :—

یہ تو تہذیب انسانی کی داستان تھی۔ اب ارتقاء
انسانی کا ذکر سنیے۔ گذشتہ نومبر میں کمبرلے (جنوبی
افریقہ) سے ۸۰ میل کے فاصلہ پر بمقام تووانگس (Tuangs)
باقیات الارض کے ماہرین نے ایک عجیب و غریب کھوپڑی
تھونڈ نکالی ہے۔ اس کے متعلق علمی حلقوں میں یہ خیال
کیا جاتا ہے کہ یہ اُس دی حیات کی کھوپڑی ہے جسے تارون
نے ”گم شدہ کڑی“ (Missing link) کہا ہے۔ یہ کھوپڑی
بندر نما انسان نہیں۔ بلکہ انسان نما بندروں کے وجود کا
پتہ دیتی ہے۔ جبرے کی ساخت حیوانی ہے۔ لیکن دماغ کے

حصے مخ اور مخیخ (Cerebrum & Cerebellum) بالکل افسانوں کے جیسے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ جانور اب سے ۵ لاکھ سال قبل موجود تھا۔ لیکن یہاں پر یہ دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا افریقہ میں اس تھام مدت میں ارتقا کا عمل ملتوی رہا حالانکہ انسان دوسرے مقامات میں ہر اعتبار سے ترقی کرتا رہا؟ اصلیت جو کچھ بھی ہو اس نئی دریافت نے محدود عقل انسانی کے لئے قیاسات کے نئے دروازے کھول دے ہیں۔

—: 0 :—

مادیت پسند یورپ سدا سے مشرقی روحانیت اور اس کے کرشموں کا منکر رہا ہے۔ لیکن آج کل روحانیت کی تحریک وہاں بھی تیزی اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس تحریک کے زبردست حامی مشہور ناول نویس سر ا۔کنن ڈائل ہیں اور مشہور سائنس دان سر آلی وریلج بھی اب روحانیوں (Spritualist) کی صف میں مل گئے ہیں۔ حال ہی میں لندن پریس کلب کی ایک دعوت میں آپ نے دور-خیالی (Telepathy) کے متعلق حسب ذیل الفاظ میں اظہار خیال فرمایا ہے —

”میں نے اس کی تحقیق کر لی ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ اصلیت پر مبنی ہے۔“

سردست ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ حواسوں کے واسطے کے علاوہ اور بھی واسطے ہیں جن کے ذریعہ سے ایک ذہن دوسرے ذہن پر اثر ڈال سکتا ہے۔ ذہن انسانی طبعی اعمال سے بے نیاز ہو کر بھی دوسرے ذہنوں تک اچھا اثر پہونچا سکتا ہے۔ وہ بغیر مادہ کے بھی ایذا وجود باقی رکھ سکتا ہے،

—:0:—

اسی سلسلہ میں ناظرین کے لئے یہ معلوم کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ سر کے فن تایل کے خلات ایک صاحب ہوتی نی (Houdini) نے ازالۂ حیثیت عرفی و بدگوئی کا ایک مقدمہ امریکہ میں دایر کیا ہے۔ مسٹر ہوتی نی ایک اطالوی نوجوان ہیں۔ آپ عرصہ تک روحانی تعریروں۔ روحوں سے گفتگو۔ روحوں کی تصویریں اور اسی قسم کے مباحث پر غور کرچکے ہیں۔ آپ نے ایک سلسلۂ مضامین میں مذہب روحانیت کی تردید کی تھی۔ اور اس کے مذکورۃ بالا مظاہرات کو شعبۂ بازی کہا تھا۔ سر کے فن تایل نے آپ کے مضامین پر ان الفاظ میں اظہار خیال کیا —

”ان کی کوئی رائے مذہب روحانیت کے متعلق قابل وقعت نہیں ہے..... انہیں چاہئے کہ

اپنے کام میں مصروف رہیں اور ایک ایسی بحث
میں نہ پڑیں جو کہ تعصب اور اُن کے مختلف
دماغ کی وجہ سے اُن کی فہم سے باہر ہے۔“

مستتر ہوتی فی کا دعویٰ ہے کہ وہ روحانیت کے
تہام کرشموں کو خود بھی دکھا سکتے ہیں۔ دیکھنا ہے کہ
مادیت اور روحانیت کے اس مقدمہ کا فیصلہ کیا ہوتا ہے —
ہماری رائے میں یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔
حق دونوں میں ہے لیکن طالب حق کو دونوں رخ پیش
نظر رکھنے چاہئیں۔ ایک رخی ضد اور تعصب سے لڑنے مرنے
پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جن کی نظر میں دونوں رخ ہیں
وہ خاموش ہیں —

—:O:—

مرد ہمیشہ سے صنف نازک پر ناقص العقل ہونے کا
الزام لگا رہے ہیں۔ لیکن زمانہ حال کی نفسیاتی تحقیق نے
اس الزام کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ امریکہ کی مختلف
یونیورسٹیوں نے جب عورتوں اور مردوں کے ذہن کی
پیمائش کی تو حسب ذیل نتیجہ برآمد ہوا۔ کو لے روتہ و کالج
میں ۵۱۱ مرد اور ۱۱۱ عورتوں کی ذہنی پیمائش کی گئی
تو دونوں صنفوں نے اوسطاً ۱۴۲ نشانات حاصل کئے۔
۴ یونیورسٹیوں کے ۳۱۷۵ طلبہ اور ۱۵۷۵ طالبات میں سے

اعلیٰ درجہ میں کامیاب ہونے والے ۷۵۶۳ فیصدی مرد تھے
اور ۷۵۶۲ عورتیں!

—————:O:—————

ہارورٹ یونیورسٹی میں جو ذہنی پیمائش کی گئی
اُس میں ایک مرد اور ایک عورت دونوں نے برابر اعلیٰ
ترین نشانات ۸۶ حاصل کئے۔ مردوں میں سب سے کم نشانات
۸ تھے اور عورتوں میں ۲۸۔ سب مردوں نے اوسطاً ۵۰
نشانات حاصل کئے اور عورتوں کے اوسط نشانات ۵۵ تھے۔

—————:O:—————

ان نتائج سے ثابت ہوتا ہے کہ باعتبار ذہانت عورتیں
مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن عورتوں اور مردوں کی
یہ مساوات اُن کی یکسانیت کو مستلزم نہیں ہے۔ پروفیسر
تھارنٹ ایک نے جو کولمبیا یونیورسٹی میں ”نفسیات
تعلیمی“ کے پروفیسر ہیں دونوں صنفوں کے خصوصیات کی
حسب ذیل تقسیم کی ہے۔ عورتیں ہجے۔ انگریزی۔ غیر ملکی
زبانیں۔ قریبی حافظ اور ذہنی خازنیت (Retentiveness)
میں مردوں سے بڑھی ہوئی ہیں۔ اور مرد تاریخ۔ جدت۔
طبیعیات۔ کیمیا اور حرکات کی صحت کے اعتبار سے عورتوں
پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ بہت جلد ہمارے
ملک میں بھی ذہنی پیمائش کے طریقے رائج ہو جائیں گے۔

ہمارے یہاں کی خواتین پر سے ناقص العقلی کا الزام اُٹھ
 جائے گا اور علمی ترقی کے جائز مواقع سے اُنہیں محروم
 نہ رکھا جائے گا —



اخبار علمیہ

مشہور بنگالی ماہر سائنس ڈاکٹر جے۔ سی۔ بوس نے روشنی کی ایسی کرنیں دریافت کر لی ہیں جو کثیف اجسام کو شفاف بنا سکتی ہیں۔

—————: 0 :—————

طبیعیات کے علاوہ ڈاکٹر بوس نے نباتات کا بھی بہت گہرا مطالعہ فرمایا ہے۔ آپ نے ایسے آلات بنائے ہیں جن کی مدد سے درختوں کی فینڈ۔ اُن میں تہیجیات کی رفتار۔ ان کی تکان اور دیگر نباتی اعمال کی تحقیق ممکن ہے۔ لیکن ابھی حال میں آپ نے ایک عجیب و غریب مشین تیار کی ہے جو درختوں کے پڑھنے کی رفتار کو ساعت بہ ساعت معلوم کر سکتی ہے۔ اس مشین کی مدد سے یہ بھی دریافت کیا جاسکتا ہے کہ کون کون سے درخت کس مقدار میں حرارت اور روشنی چاہتے ہیں۔

—————: 0 :—————

آسٹریا کے ایک سائنس دان نے فقلی شیشہ تیار کیا ہے۔

یہ شیشہ مختلف اقسام کے سریشوں سے بنایا گیا ہے۔ یہ بالکل بے رنگ ہے اور پائیداری اور چمک کے اعتبار سے اصلی شیشہ سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔ واٹنا کی یونیورسٹی میں اس کے خواص کے متعلق تجربے کئے جا چکے ہیں اور توقع کی جاتی ہے کہ اس دریافت کا اثر شیشہ سازی کی صنعت پر بہت گہرا ہوگا۔

—:O:—

اب تک طیارے بنانے کی غرض یہ ہوتی تھی کہ مختلف ملکوں کے درمیان فضائی سلسلہ تجارت و سفر قائم ہو۔ لیکن حال میں کپتان جی۔ تی۔ ہاوی لان نے ایک چھوٹا دوفت کا طیارہ بنایا ہے جو ”فضائی تفریح“ کا کام دے گا۔ اور جس طرح آج کل لوگ موٹروں یا گاڑیوں پر ہوا خوری کرتے ہیں اس پر بھی کرسکیں گے۔ یہ طیارہ ایک چھوٹے موٹر خانے میں آسانی کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔ ۲ منٹ سے کم میں اس کے پر پرزے سمیٹے جاسکتے ہیں۔ اس کی رفتار ۳۸ میل فی ساعت سے ۹۰ میل تک کی ہے۔ اس میں پٹرول کا صرف ۳۰ میل فی گیلن ہوگا۔ یہ مکمل طیارہ ۸۵۰ پونڈ میں فروخت کیا جاسکے گا۔

—:O:—

وینس اٹلی کا مشہور شہر ہے اور ”ملکہ بحرین“ کے

نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سڑکوں کی بجائے یہاں آمد و رفت نہروں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ لیکن اب اس شہر میں بھی زیر زمین ریلوے نکالی جا رہی ہے۔ یہ ریل شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جائیگی۔ اس کا طول ۸ میل ہوگا۔

—:O:—

ہر شخص جانتا ہے کہ متعدی امراض کے جراثیم اکثر اوقات مکھیوں کے ذریعہ سے دوسروں تک پہنچتے ہیں۔ یہ خرد بین کی مدد سے دکھائی دیتے ہیں لیکن حال میں ایک عجیب و غریب طریقے سے ایک مکھی کا عکس کلاں نما شیشوں کی مدد سے بائیسکوپ کے پردوں پر ڈالا گیا۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ تائیفاؤڈ (موتی جھرہ) کے ۷۰۰۰۰۰۰ جراثیم اس ایک مکھی میں موجود تھے۔

—:O:—

اب تک علم تشریح الاعضا کی حیرت انگیز ایجادیں زمانہ حال سے منسوب کی جاتی تھیں۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ اب سے ۱/۲ ۴ صدی قبل اس علم نے اتلی میں بہت کچھ ترقی کر لی تھی۔ وہاں کے ماہرین تشریح ضائع شدہ ناک۔ کان۔ اور ہونٹ کو درست کرنا اور انہیں ازسرنو بنانا جانتے تھے۔

—:O:—

مشہور مرہتہ سردار شیواجی کی نسل کا خاتمہ
گزشتہ ماہ میں ہو گیا۔ شری مذت پر قاپ سنگھ المعروف بہ
بھاو صاحب چتراپت۔ مہاراجہ ستارہ اس نسل کے آخری
فرد تھے۔ ان کا انتقال گزشتہ ماہ میں ستارہ میں ہو گیا ہے۔

—:0:—

انگلستان کے مشہور ماہر طبیعیات پروفیسر رس آج
کل یہ تجربہ کر رہے ہیں کہ آیا مصنوعی طریقوں کی مدد
سے انسانی بصارت کو اس حد تک تیز کیا جاسکتا ہے یا نہیں
کہ اندھیرے کی چیزیں دکھائی دیں۔ پروفیسر موصوف کا
خیال ہے کہ ہماری بصارت میں ۱۵ فیصدی کے قریب
اضافہ ممکن ہے۔

—:0:—

جل ویدک (Water-cure) اب تک بخار اور مختلف
قسم کے درد کے لئے مفید سمجھی جاتی تھی۔ لیکن ابھی
حال میں اس کے ذریعہ سے ایک ایسے شخص کا علاج کیا گیا
ہے جس کا ۲/۳ جسم جل چکا تھا اور جس کے بچنے کی کوئی
توقع نہ تھی۔ یہ شخص چھ روز تک پانی کے ایک ٹب میں
رکھا گیا۔ پانی برابر بدلا جاتا تھا اور اس شخص کو بہت
سا پانی پلایا جاتا تھا اور کوئی علاج نہیں کیا گیا۔ یہ شخص
اب اچھا ہے اور ایک ہفتہ کے اندر اپنی معمولی

حالت پر آجائے گا۔

—: 0 :—

لندن میں عنقریب ایک نئے قسم کی تربیم چلائی جائے گی۔ اس کو صرف ایک شخص چلائے گا۔ اس گاری کے دروازے اس قسم کے ہیں کہ جب تک گاری متحرک رہے وہ کھل نہیں سکتے۔ گاری کے رک جانے کے بعد بھی اس وقت تک دروازے نہیں کھل سکتے جب تک کہ کوئی شخص پائڈان کے قریب اترنے کے لئے تیار نہ کھڑا ہو۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس ایجاد سے تربیموں کے حادثوں میں کمی ہو جائے گی۔

—: 0 :—

امریکہ میں آج کل دنیا کا سب سے بڑا گیس پائپ بنایا جا رہا ہے۔ اس کا قطر ۱۶ انچہ اور لمبائی ۲۱۰ میل ہے۔ یہ پائپ بے جوڑ ہوگا اور زمین کے اندر ہی اندر کئی غاروں۔ چار ریاستوں اور دو دریاؤں میں سے ہو کر گزرے گا۔

—: 0 :—

مکروبیات "Bacteriology" کے متعلق تازہ ترین تحقیق

پروفیسر آر۔ سی گرین۔ پروفیسر مکروبیات می فی سوٹا یونیورسٹی کی ہے۔ آپ نے بڑی کاوش کے بعد خود جراثیم میں سے ایسے چھوٹے چھوٹے جراثیم علیحدہ کر لئے ہیں جو

اول الذکر سے چمٹتے رہتے ہیں اور اپنی خوراک انہی سے حاصل کرتے ہیں۔ جس طرح جراثیم جسم انسانی سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں اسی طرح سے یہ چھوٹے جراثیم ان بڑے جراثیم کے زلہ خوار ہیں۔ پروفیسر موصوت کا دعویٰ ہے کہ یہ نئی چیز ہر قسم کے جراثیم کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ انہوں نے جب متعدی امراض کے جراثیم رکھنے والے اجزا کو مقطر کیا تو انہیں ایک سفید سی رقیق شے دستیاب ہوئی۔ جب اس کا ایک قطرہ ایسے پانی میں ڈالا گیا جس میں پہلے سے جراثیم موجود تھے تو یہ سب کے سب چند گھنٹوں کے اندر مر گئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر اس چیز کو دس لاکھ گنا پانی میں ڈالا جائے تو بھی یہ جراثیم کے لئے مہلک ہوتی ہے اس دریافت سے متعدی امراض کے علاج میں بہت بڑی مدد ملے گی۔

—: ۰ :—

ملیریا کے جتنے واقعات ہوتے ہیں اُن سب کا باعث تَنک دار مچھر ہیں اور اُن کے دفعیہ کے لئے دوائیں بھی ہیں۔ لیکن حال میں جو بیان ڈاکٹر لوی پال لی جنڈر نے فرانس کی مجلس علوم کے روبرو دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مچھروں کے سب سے بڑے دشمن خود ایک قسم کے بے تَنک کے مچھر ہیں۔ یہ بے تَنک کے مچھر بری تَنے کی

مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں اور ان کی مدد سے
مچھروں کی دستبرد سے نجات مل سکتی ہے۔

—:O:—

ڈاکٹر رابرٹ-ایچ گالت پروفیسر نفسیات نارٹھ وسترن
یونیورسٹی نے حال میں ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس کی
مدد سے بہرے سے بہرا شخص بھی ہتیلیوں کے ذریعہ سے آواز کا
احساس کر سکے گا۔ چنانچہ اس آلہ کی مدد سے ڈاکٹر صاحب
موصوف نے پانچ بہرے آدمیوں کو ۱۵ جملے سکھائے ہیں
اور وہ ہتیلیوں کے ذریعہ سے ان جملوں کو ”سنکر“
پہچان سکتے ہیں۔ یہ آلہ ٹیلیفون کے صوت-گیر (Receiver)
کی طرح ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ آواز کے ارتعاشات
بجائے کان کے ہاتھ کی ہتیلیوں پر پڑتے ہیں اور ان کی
مدد سے آوازیں پہچانی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف
آج کل یونیورسٹی سے رخصت لے کر اپنے آلہ کی تکمیل
میں مصروف ہیں۔

—:O:—

پرتگال کے ایک مقام پر ایسی توپ موجود ہے جو خود
بخود دن کے بارے بجے دگتی ہے۔ برے برے کلان نہا شیشوں
کو اس ترکیب سے رکھا گیا ہے کہ تھیک بارے بجے سورج
کی شعاعیں ان سے مرتکز ہو کر توپ کی نال پر پڑتی ہیں اور

وہ چل جاتی ہے۔ خدا معلوم ابر یا بارش کی صورت میں اس ”خود-سر“ توپ کے چلانے کی کیا ترکیب کی جاتی ہے —

—:O:—

فرانسیسی زراعت کو مزدوروں کی قلت سے نجات دلانے کے لئے وہاں کی حکومت زرعی فارمون میں بجلی کا استعمال کثرت سے کر رہی ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ وہاں آج کل گایوں کو دھنے۔ مکھن نکالنے اور بالائی چھانٹنے کا کام بجلی سے لیا جاتا ہے —

—:O:—

ایک کیمیا دان نے مچھلی کے چھلکوں سے ایسے موتی تیار کر لئے ہیں جو آب و تاب کے لحاظ سے اصلی موتیوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ان مصنوعی موتیوں کا ہار ۲۰۰ ڈالر (تقریباً ۶۰۰ روپیہ) تک دستیاب ہو سکتا ہے —

—:O:—

ابھی حال میں ایک ایسی موٹر سائیکل بنائی گئی ہے جو خشکی و تری میں یکساں کام دے سکے گی —



بانی بدھ مت سے مخاطب

کچھ عرصہ قبل اجنتہ کے غاروں کی زیارت کا اتفاق ہوا۔ اُن غاروں کو دیکھنے سے جو اثر دل پر ہوا اُس کو ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ گو یہ نہایت مشکل کام ہے لیکن اپنی بساط کے موافق قلم بند کرنے کی جرأت کی۔ اس کے آئے میں نے اس مضمون کو چار حصوں میں چار عنوان کے تحت تقسیم کیا ہے۔

پہلا عنوان ”شہزادہ گوتم سے خطاب“ اس میں عیش و عشرت کی زندگی کو لات مار کے شہزادہ گوتم کا جنگل میں ریاضت ہائے شاقہ کرنے کا نہایت مختصر ذکر کیا ہے۔ دوسرا عنوان ”بدھ سے خطاب“ اس عنوان کے تحت بدھ کی ابتدائی تعلیم اور اُس کے متعلق مختلف طبقوں کے خیالات کا مختصر حال درج ہے۔ تیسرا عنوان ”مہاتما بدھ سے خطاب“ جب بدھ کی تعلیم نے لوگوں کے دلوں میں گہر کر لیا اور لوگ جوق جوق اُس کے پیرو بنتے جا رہے تھے اس کا مختصر خاکہ اور آخری وقت کا ذکر کیا ہے۔ چوتھا عنوان

”مہاتما جی کی رنگین تصویر یا سنگی مورت سے خطاب“
 اس میں یہ آرزو کی گئی ہے کہ آج وہی مہاتما ہمارا رہبر
 بنے۔ کیوں کہ ہم کر ایک ایسے معلم کی ضرورت ہے جو
 ”خاموشی لیکن پر جوشی“ کا درس دے۔

شہزادہ گوتم سے خطاب

گیانی گُنی گوتم! تو کپل وستو کی آباد خوبصورت
 نگری سے کیوں برداشتہ ہو گیا ہے۔ آج جب کہ تیرے لڑکے
 کی ولادت کی خوشی میں رقص و سرود کے جلسے ہو رہے
 ہیں۔ تو جنگل کی طرف کیوں اس قدر بے چینی سے قدم
 بڑھائے جا رہا ہے۔ غضب! یہ وحشت کیسی؟ تو نے صاحب
 تخت و تاج کے گھر جنم لیا آرام و آسائش کے گہوارے
 میں پرورش پائی۔ رنج و الم سے بیگانہ ہے۔ پھر دنیا سے اس
 قدر گھبرا اُٹھنا تعجب سے خالی نہیں۔ اللہ! بتادے یہ
 اضطراب کیا ہے۔ خیر نہ سہی۔ تو یونہی تیز قدمی کٹے جا۔ میں
 دیکھ لوں گا۔ جہاں تو اپنی اس وحشت اور بے چینی کو
 سکوت اور چین سے بدل دے گا۔

اُت رے بے چینی! یہ لق و دق جنگل جا بجا دراوڑی
 جہازوں کے جھنڈ۔ جھلسے ہوئے خاردار درختوں کے جھرمٹ
 غیر مسطح زمیں کبھی تیز و تند ہوا کے جھونکے اور کبھی
 سناتے کا عالم۔ یہ جنوں خیز منظر تجھے کیوں کر بھایا۔ کیا

لبنی کا خوش نما باغ کہ جہاں رنگ برنگ کے پھولوں کے
تختے انسان کو محو نظارہ کر دیتے ہیں تیری آنکھوں
کو خوش نہیں آتا۔ بلبلوں کے سریلے نغموں کے مقابلے میں
جنگلی پرندوں کی کرخت آوازیں تیرے کانوں کو کیوں کر
بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ سوسائٹی کی نعمتوں سے بیزار ہو
کر تو اس ہو کے عالم میں تنہائی کا مورد عذاب بننے کیوں
جارہا ہے۔ حکومت، تزک و احتشام، شوکت و شان، جاہ و
ثروت تیری نظر میں کیوں ہیچ و پوچ ہیں۔ بے سرو
سامانی اور تنہائی کو کیوں قابل ترجیح سمجھتا ہے ؟
یہ چیزیں نہ سہی تو کیا دنیا میں کوئی بھی ایسی شے
نہیں جو تیرے دل کو لبھا سکے ؟ کیا دنیا کی سحر کاریاں
اتنی بے سود ہو گئی ہیں !

اے دنیا کیا تو گوتم کے مقابلے میں اپنی خرد فریب
ادائیں بھول گئی۔ جا اور شہزادہ گوتم پر اپنا جادو چلا۔ ناکام
دنیا۔ تیرا طلسم اس پر بے اثر ہے۔ بزرگوار حالی نے اس کے
کان میں کہہ کر تیرا رہا سہا کام بگاڑ دیا۔

دنیا کی حقیقت نہیں جز حسرت و حرمان

چھل بل میں تم اس زال فسوں گر کی نہ آنا

شہزادہ گوتم ! اُن تیس برس عیش پسندی و عشرت

دوستی میں گزارنے کے بعد تجھے پر یہ دشت نور دی

کیوں کر نہ کتھن گزرے۔ اس کی صعوبتوں سے تیرا گلاب
 سا چہرہ جھلس گیا۔ تو جس چیز کی تلاش میں ہے کیا وہ
 صحرا ہی میں گم ہو گئی ہے؟ کیا وہ عالیشان پر رونق
 شہروں میں نہیں مل سکتی؟

ہیں! یہ تو کیا کیا کرتا ہے؟ پہروں آنکھیں بند کئے
 خاموشی میں توب جانا، پھر گھبرا کر اُٹھنا، تھوڑی دیر
 ادھر ادھر بھٹکنا اور چور ہو کر پھر خاموشی میں غرق
 ہو جانا، بتا تو کس تصور میں محو رہتا ہے؟ گوتم یہ
 کون سا تصور ہے جو روز بہ روز بڑھتا جاتا ہے۔ آج تو تو نے
 آنکھ کھولنے کی قسم کھائی ہے۔ پہروں گزر گئے اور تو نہ
 معلوم کس خیال اور کس سوچ میں غرق ہے جو آنکھ تک کھول
 کر نہیں دیکھتا۔؟ آج صحراے وحشت انگیز بھی بالکل
 بے اثر ہو گیا ہے۔ اُس کی ہر چیز تیرے اطمینان و سکوت میں
 اضافہ کر رہی ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے؟

گوتم! تیرے چہرے سے بھی غیر معمولی مسرت کے
 آثار نمایاں ہیں۔ بتا کس نسیم کے جھونکے نے تیرے غنچے
 دل کو گدگدایا اور کس لطیفہ غیبی نے یہ کام کیا کہ تیرا دل
 خوشی سے جگمگا اُٹھا۔ جس درخت کے نیچے تو شراب مسرت
 میں سرشار ہے۔ اُس میں بھی وہ نشاط انگیز رس دوڑ گیا
 ہے کہ اُس کی ہر شاخ مستی کے عالم میں جھوم رہی ہے۔ —

آخر اس بشاشت کی کیا وجہ ہے ؟ کیا تو خیالی پلاو
 کی کسی ضیافت میں تو مصروف نہیں ہے ؟ لیکن نہیں۔ تیری
 منجیدہ صورت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تو نے خیالی دنیا
 میں کوئی اور فتح یابی حاصل کی ہے۔ بتا تصور میں توب
 کر تو نے کیا پایا ؟ خاموش ! اُتھا بھی تو خاموش ہے۔ اُتھ کر
 اب تو کہاں جا رہا ہے۔ آبادی کا کیوں رخ کیا ؟ خراماں
 خراماں وطن کی طرف تو جا رہا ہے۔ لیکن وطن والوں کے لئے
 سوغات ؟ خاموش ! کیا وہاں چل کر کوئی مژدہ جافزا
 سنانے والا ہے ؟ چل چل اور اس دلکش نغمہ کو جلد سنا جس
 کے لئے میرے کان نہایت مشتاق ہیں۔

تیری آمد آمد سن کر تمام شہر نہایت حیرت و تردد
 میں پڑ گیا ہے۔ کوئی کہتا ہے حکومت کا شوق کھینچ لایا۔ کوئی
 کہتا ہے تنہائی کی صعوبتوں نے گھبرا دیا۔ غرض تیری آمد
 نے لوگوں میں عجب ہل چل مالدی ہے۔ لیکن اس موقع پر
 صرف عوام ہی خوش نظر آتے ہیں۔ دوسرے طبقوں پر
 مردنی چھائی ہوئی ہے۔ یہ تو کیا کہہ رہا ہے ؟ جس کو سن
 کر علما کا گروہ ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ حامیان مذہب تجھے
 کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ صرف عوام ہی
 کی جماعت تجھے کو گھیرے ہوئے ہے۔ جو تجھے بدھ (تجلی
 یافتہ یا روشن ضمیر) کہہ کر پکار رہی ہے۔

دولت حکومت تیرا ساتھ نہ دے۔ مذہب اور دین
تجھے حقیر جانے۔ نغمہ سرائی کے لئے تجھے اپنی پیاری زبان
(سنسکرت) ترک کرنی پڑی۔ لیکن دل گواہی دیتا ہے کہ
تیرا نغمہ خارج از آہنگ نہیں۔ انسانی زندگی پر تیری
نوحہ زنی بھونڈی پراکرت میں بھی درد سے خالی نہیں۔
تیری زبان سے جو لفظ نکل رہا ہے صداقت میں تروبا ہوا۔
تیری ہر بات دل میں گھر کر رہی ہے۔ جادو بیانی تجھ
میں نہیں۔ دھواں دھار تقریر سے مسخر کرنا تیرا فن
نہیں۔ لیکن صداقت کا اظہار مختصر الفاظ میں ایک ایسا
اسم اعظم ہے جو ان تھام شریف فنون سے کہیں زیادہ
افضل اور کارگر ہے۔

گو تم! سراپا صداقت۔ واقعی تو بدھ کہلائے جانے کا
مستحق ہے۔ اب میں بھی اسی لقب سے خطاب کرنے کی
اجازت چاہتا ہوں۔

بدھ سے خطاب

” افسانی زندگی سراپا رنج و آلام ہے۔ آلام کی وجہ
خواہش ہے پس خواہشات کو متانا چاہئے۔“

کہہ! بار بار کہہ۔ بھینٹ چڑھاوے سے نفس افسانی کی
کدورت دور نہیں ہو سکتی۔ واقعی نفس کشی کا یہ طریقہ
نہایت مہمل و بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔ اوہام و اصنام پرستی

نروان (نجات روح) کا ذریعہ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ تیری نظروں میں نوع انسان کا ہر فرد ایک حیثیت رکھتا ہے۔ ذات پات کا امتیاز جائز نہیں۔ تیرے راستہ پر ہر ادنیٰ سے ادنیٰ قوم کا آدمی اسی طرح چل سکتا ہے جس طرح دولت مند لوگ۔ یہ سیدھی سادی سچی تعلیم لوگ کیوں نہ قبول کریں! —

بدھ! متوسط طبقے نے تیری روش پر چلنے کا شرت حاصل کر لیا ہے مہول اور ذی جاہ لوگوں کے دلوں کو تیری صادق البیانی مسخر کر رہی ہے۔ کیوں؟

تیرا ہر لفظ وہ سرور انگیز نغمہ ہے جو دلوں پر وجد حقیقت طاری کر دیتا ہے۔ تیری ہر حرکت وہ عشوہ شیریں ہے۔ جو دلوں کو حق پرستی کے لئے بے قاب کر دیتا ہے۔ عیش و عشرت کے خم لذت ہانے والے بھی عشرت کدوں سے تیرے تپشیا ستھان (مقام عبادت) کی زیارت کو آرہے ہیں۔ غرض جو راستہ تو دکھا رہا ہے وہ وہ شاہ راہ حقیقت ہے جس پر ہر ادنیٰ و اعلیٰ منزل مقصود تک پہنچنے کا امکان رکھتا ہے —

بدھ! تیری ظلمت سوز تعلیم نے دنیا کو روشن کر دیا۔ دولت۔ حکومت تیرے احسان مندوں کی ہم نوائی کر رہی ہے۔ تیری اس تعلیم کے طفیل میں امن و اطمینان کو

حکمرانی کا موقع ملا۔ ظلمت کدۂ دنیا میں یہ جلوہ ریزی دیکھ کر خلق تجھے سہاتما بدھ کہہ رہی ہے۔ میں بھی سہاتما کے لفظ کے اضافہ سے تیری سمع خراشی ذرا دیر اور کروں گا۔

سہاتما بدھ سے خطاب

سہاتما بدھ! تیری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔ اب تو جا اور اپنی بوسیدہ ہڈیوں کو ہمیشہ کے لئے سپرد خاک کر دے۔ لیکن قبل اس کے کہ تیرا مرغ روح پرواز کرے اخیر بار وہ ترنم ریزی کر جس سے دلوں پر وہی وجدان رہے۔ تیرا عزیز شاگرد نندا تیرے سامنے سر نہوڑاے بیٹھا ہے۔ اس سے تو کیا ہی رس بھری آواز میں کہہ رہا ہے ”اے نندا“! میرا آفتاب عمر غروب ہونے کو ہے۔ میں نے زندگی کے اسی (۸۰) برس جو میری تقدیر میں تھے پورے کر لئے۔ اب میرا جسم ٹوٹی پھوٹی گاری کی طرح مشکل سے حرکت کر سکتا ہے۔ آئندہ سے تم خود اپنی شمع بنو اور خود ہی اپنا بچاؤ کرو۔ کسی اور جگہ پناہ نہ لینا۔ حق دار الاماں ہے۔ جب میں نہ ہوں تو وہ حقائق و اوامر جو میں نے تم کو تعلیم کئے ہیں تمہارے رہبر ہوں گے۔ اُنہی کی پیروی کرنا“ —

اجل سر پر منڈلا رہی ہے۔ لیکن تو نہایت اطمینان سے

حق پرستی کی تلقین کر رہا ہے۔ تیرے درد مند دل سے وہی
 صداے حق نکل رہی ہے۔ اُدھر پیام موت کا انتظار۔ اُدھر
 پیام حق سنانے کا اشتیاق۔ اس کشمکش میں بھی تو تبلیغ
 حق میں سرگرم ہے۔ بس کر۔ اور اب تو آخری سانس اس
 اُمید میں لے کہ تیرے شاگرد اور چیلے تیرے راستے پر
 چلیں گے۔ ہر کس و ناکس تیرے دھرم کی تبلیغ میں کوشاں
 رہیگا۔ حکومت اقطاع عالم میں واعظوں کو پھیلا کر تیرے
 دھرم کی اشاعت کرے گی۔ ملکوں میں تیرے دھرم کا
 دَفا بچے گا۔ شہروں میں تیرے دھرم کی پکار ہوگی۔ بازاروں
 میں تیرے دھرم کی چہل پھل ہوگی۔ جنگلوں اور پہاڑوں
 میں تیرے ہی دھرم کی آوازیں گونجیں گی۔

لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تیرا دھرم عمل سے گزر کر
 کہیں کتاب کی سرحد میں داخل نہ ہو جائے۔ زبان کا لباس
 بدل کر کہیں دوسرے برقع میں روپوش نہ ہو جائے۔ خیر۔
 تو معاف کر اور جا۔ تیرے بعد اگر خدا نخواستہ یہ قصہ
 ظہور کرے تو ہر ممکن طریقے سے سناؤں گا۔

—: 0 :—

یہ سچی تعلیم بہ سرعت دنیا کے دور دراز حصوں
 میں اثر کر گئی لیکن زمانے کے انقلاب اور علی الخصوص
 ہندوستان میں علما (برہمن قوم کے) کی وجہ سے یہ دھرم

تقریباً مت کیا۔ خیر۔ جو کچھ ہوا برا ہوا۔ اب فکر کرنی چاہئے
یہ الم ناک داستان کسی طرح مہاتما جی کے گوش زد ہو
جائے۔ سنا ہے کہ اجنٹہ و ایلورا کے غاروں میں عقیدت کے
سنگ تراشوں اور مصوروں نے مہاتما جی کو ہمیشہ کے لئے
زندہ کر دیا ہے۔ غرض وہاں مہاتما جی عقیدت کیش
مصوروں کی بدولت مل سکتے ہیں۔ اب ان سے ملاقات کرنی
چاہئے۔ لیکن ان سے یہ حسرت ناک داستان صاف صاف
افغلوں میں نہ سننا چاہئے بلکہ دوسرے دھنگ میں۔

مہاتما جی کی رنگیں تصویر

یا سنگی مورت سے خطاب

اُو لذات روحانی کے دھنی۔ نراون کے حاسی۔ امن و صلح
کے ہادی۔ اٹھ اور مکروہات دنیا کے گرفتاروں کو نجات
دلا۔ حرص و آرزو کو مٹا۔ کشت و خون کو امن و سکون سے بدل۔
مکر و فریب کو راستی و دیانت کے ہاتھوں صفحہ دھر سے
بے نشان کر دے۔

اُو برق استغنا! کرک اور گر۔ کرک کے خوشامد پسند
اور مہدوح کے خود فروش کانوں کے پردوں کو پھاڑ دے۔
گر کر خوشامد اور مدح کے آشیانہ کو جلا کر خاک کر دے۔
غرض ہماری رگ رگ میں بے نیازی کا خون دوڑے۔ استغنا
کی یہ شان ہو کہ ضروریات خود بخود بے کل ہو کر رفع

ہونے لگیں۔ مگر او بدھہ ست۔ خموشی! یاد رہے کہ
 ”خموشی لیکن پر جوشی“ کا درس ہو۔ تو گوشہ تنہائی
 میں روحانیت پر حکمرانی کرتا تھا۔ اس وقت ظلمت کدہ
 دنیا میں یہ ضوفشانی روا تھی۔ لیکن آج جب کہ تیرا جنم بھوم
 تہذیب کی معشر خرامی سے بیدار ہے عزلت نشینی اس کے لئے
 عذاب ہے۔ اب ایسا درس دے کہ ہم بازار دنیا میں سرگرم
 کار رہیں۔ لیکن باغ روحانیت سے نسیم خوش خرام اپنی
 مستانہ روی میں ہم سے اٹھکھیلیاں کرتی جائے جس کی
 خوشبو سے ہمارے دل مست اور دماغ معطر ہو جائیں۔

شیخ چاند متعلم

اورنگ آباد کالج



نورسوں سے خطاب از

(جذاب مولوی عبدالقدیر صاحب قدیر)

(ایولہ ضلع ناسک)

خوابیدہ تغافل سر گرم کار ہو جا

اُٹھہ شاہدِ عمل سے پھر ہمکنار ہو جا

وہ دیکھ ہے فروزاں شمعِ ادبِ نگاری

اُس پر نثار تو بھی پروافہ وار ہو جا

تا بندہٴ اُفق ہے مہرِ علومِ حاضر

ہاں کھول جلد آنکھیں اُس سے دوچار ہو جا

خمخانہٴ ادب کا پی جامِ روح پرور

کیفِ آوری سے اس کی معوِ خمار ہو جا

گمنامی مشاغلِ عزلت نشینِ تاکِ

بامِ شہود پر چرہ اور آشکار ہو جا

منوا کے اپنا لوہا لیکر خراجِ تحسین

اقلیمِ علم و فن کا اک شہسوار ہو جا

باد بہار آئی آمادۂ عمل ہو
اب تیری زندگی کا اک یہ ہی ماحصل ہو

کشت ادب کو وقف آب خیال کر دے
سرسبز بندشوں سے اُس کو نہال کر دے
کر پیشکش مرقع گلریزی قلم کا
تفسیر روزگار ماضی و حال کر دے
بھر دامن صحافت گوہر فشانہوں سے
دنیا کو آشنائے بذل و نوال کر دے
پھر مائل شغف ہو دادِ دادۂ تفضل
چمکا کے اُس کو مثل بدر کہاں کر دے
اخلاق سوز نظمیں ہوں صرت طاق نسیاں
ایسی سخنوری کو تو پائمال کر دے
ہو مزرع دکن میں نشو و نماے اُردو
اپنی زمین کو بھی ارض شہال کر دے
کر دل میں شوق پیدا کچھہ اکتساب فن کا
ھے کچھہ بھلا اسی میں ارباب انجمن کا



خاموش گویائی

اجنّہ کی تصویریں تیسری سے لے کر آٹھویں صدی عیسوی تک کی صنعت کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ متجسس نگاہوں کو ان تصاویر میں حسب ذیل نظارے دکھائی دیتے ہیں—

امرا مسند اور تخت شاہی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی کمر کے گرد ایک تھیلا کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ ان کی پیشانیوں پر پوت کی پتی یا جواہرات کی کلغی آویزاں ہے۔ گلے میں ایک وزنی مالا ہے۔ قیمتی بازو بند ہلکی اور سادہ پہونچیاں اور دوسرے زیورات ہیں۔ گھر سے باہر نکلتے وقت وہ سایہ کے لئے چھتری رکھتے ہیں یا تلوار۔ نیزے اور تیر وغیرہ لے جاتے ہیں۔ جھومر دار تاج جاکت اور پاجامے اور ایک لمبا پانچ توریوں کی مالا۔ خوبصورت بازو بند اور سادہ وزنی پہونچیاں پہنتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مکانات و محلات الکڑی کے تھے جو دو منزلہ تھے

اور ان کی چھتیں چوڑی-چوڑی دار یا مخروط میناروں کی تھیں اور کھرے ستونوں کے ذریعہ تقسیم کئے گئے تھے۔ بارگاہ شاہی میں فیلی مسندیں-گدی دار نشست-سوزنی اور تکیہ یا چوپایہ چھتری دار تخت-ایک فیچا شہ نشین-تپائیاں اور پیک دان وغیرہ نظر آتے ہیں-زنانہ کمروں میں سوفے-جدید وضع کے پلنگ-باورچی خانوں میں پتھر کی فرشی-رکابیاں-پانی کے کوزے اور پیالے ہیں-بالائی منزلوں میں سائبان دار دریچے نظر آتے ہیں—

امرا کی بیویاں اُسی مسند پر یا کسی دوسری قریب کی مسند پر اپنے خاوند کے سیدھے جانب بیتھی ہوئی یا اپنے کمروں میں جھولتی ہوئی کوچ پر لپٹی دکھائی گئی ہیں۔ بعض کے بال سامنے کی طرف جھے ہوئے یا ایک موبات سے پیشانی پر بندھے ہوئے ہیں۔ بعض پھول کے تاج یا سر اور پیشانی کے زیور پہنی ہوئی ہیں۔ ان کا لباس مہین ریشم کا ہے—

وزیر کے جسم پر قیمتی زیور ہیں اور ایک ^{کافی} صلی ہے جو امرا کی کلگیوں سے ذرا نیچے آویزان ہے لیکن امرا کی طرح اس کا جسم بھی کھر سے اوپر برہنہ ہے۔ اکثر امرا کے پاس جواہرات ہیں۔ ان کے سروں کے اطراف کپڑا بندھا ہوا ہے اور تھام جسم فیلی-سفید یا سنہری پوشاک

سے ملبوس اور قاروں اور زیور سے مزین ہے۔ بیگموں کے پاس بھی قیمتی جواہرات ہیں اور نہایت سہیں ریشمی جامے اُن کے جسم پر ہیں۔

خادموں کے پاس جواہرات کم اور کپڑے زیادہ ہیں۔ قلی سر سے پاؤں تک ملبوس نظر آتے ہیں۔ دوسرے خادموں کے سر کے اطراف ایک کپڑا بندھا ہوا ہے اور وہ سفید آستینوں دار سرزائی پہنے ہیں۔ بعض کے کپڑے چست اور نیلے رنگ کے ہیں۔ اُن کی توپیاں تاج کی قسم کی اونچی ہیں اور وہ تغک کوت پہنے ہوئے ہیں۔ مکانوں میں وہ اپنے سروں پر پانی کے برتن اور کندھوں پر رکابیاں لے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ امیروں کے پاؤں دباتے اور چوکیداری کرتے ہیں۔ باہر وہ چھتیریاں یا جھنڈے پکڑتے۔ گھوڑے تھامتے اور گھانس یا پتوں کے گتھے لکڑی کے سہارے لے جاتے ہیں۔ اکثر خدام بونے معلوم ہوتے ہیں اور ان کا لباس بھی عجیب ہے۔ لونڈیوں کے بال ہموار ہیں اور سوبات سے بندھے ہوئے ہیں یا گھونگھر والے ہیں اور کپڑے سے تھکے ہوئے ہیں۔ بعض کے لباس جسم پر منڈھے ہوئے ہیں۔ اس پر زردوزی کا کام ہے۔ بعض انگیا اور دھاری دار گھاگرا یا ایک نیلا دھاریوں دار کپڑا اور چھوٹا گھاگرا پہنی ہوئی ہیں۔ بعض نے بوٹے دار انگیا

پہن رکھی ہے اور اُن کے اعضا گدے ہوئے ہیں۔ بعض سفید پھولوں کی سیاہ انگیا اور نیلا دھاری دار لہنگا پہنی ہوئی ہیں۔ بعض کے جسم پر لبادہ سر پر چوٹی دار لباس ہے۔ سہیلیاں چوری یا چھتری لئے ہوئی ہیں اور پھول کی طشتریاں اور مٹھائی کی کشتیاں پیش کرتی ہوئی دکھائی گئی ہیں۔ برتن اور کباب کی سیخیں لیجاتی ہوئی اور کنگن اور جواہرات کے صندوقچے تھامے ہوئے نظر آتی ہیں بیگمہوں کے کھروں میں وہ اپنی مالکہ کے سر پر پانی ڈالتی ہیں۔ اُس کے پاؤں دباتی ہیں اور تھیلے اور برتن وغیرہ لیجاتی ہیں اور بعض وقت ہاتھ میں لکڑی لئے سر سے پاؤں تک ملبوس پہاٹک پر نکھبانی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

ابتدائی تصویروں میں تھام پیدل سپاہ ہے اور اُن کے سر یا تو ننگے ہیں یا کپڑے سے مضبوط بندھے ہوئے ہیں اور ایک چھوٹی مالا اور بازو بند کے سوا سب کے جسم کھر سے اوپر برہنہ ہیں۔ اُن کے ہتھیار کلہاریاں نیزے اور سیخیں ہیں۔ بعد کی تصویروں میں گھوڑ چڑھی فوجیں۔ تیر انداز۔ نیزہ بردار اور پیدل سپاہ نظر آتی ہے۔ چھوٹے دھاریدار گھاگرے پہنے ہوئے ہیں اور جن کے گھنے بال فیتے سے بندھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ہتھیار سیدھی لہبی اور خمدار

نیپالی تلواریں۔ نیزے کھان اور تیر۔ لٹھے اور چکر وغیرہ
 ہیں۔ بعض آدمی ایسے جھنڈے اُٹھائے ہوئے نظر آتے ہیں
 جن کی انیوں پر بیضوی قرص بنی ہوئی ہے —

اگرچہ دستکاروں اور تاجروں کی تصویریں نہیں ہیں
 مگر لباس اور زیور سے ثابت ہوتا ہے کہ سنار جلاھے اور
 زردوز ہوشیار آدمی تھے۔ اُس زمانہ کے بازو بند آجکل کے
 بازو بند سے بالکل مشابہ ہیں۔ پالکیاں دکھائی گئی ہیں
 اور آدمی گاڑیوں کو کھنیچ رہے ہیں۔ ایک تین گھوڑوں کی
 تصویر کے علاوہ جو پہلو بہ پہلو جتے ہوئے ہیں اور جس کے
 اندر چار آدمی بیٹھے ہیں ایک دو گھوڑوں کا پتھر کا رتھ
 ہے۔ جہاز بھی دکھائے گئے ہیں۔ جن کی کھانیاں اور پچھلا حصہ
 اونچا و چوٹی دار ہے یا جن میں تین مستول ہیں۔ ہر ایک
 کے بادبان تھے ہوئے اور ہوا میں اُرتے ہوئے دکھائی دیتے
 ہیں۔ اُن کے بیچ کے حصے اونچے ہیں اور ان میں تین مستطیل
 سوراخ ہیں جن کے پچھلے حصہ کے دونوں طرف اور کھان
 کی ایک طرف چپو چلا سکتے ہیں۔ ایک جہاز موتی و
 مرجان کے ٹکڑے لٹے جا رہا ہے اور دوسرے میں گھوڑے
 اور ہاتھی ہیں —

کسان گھوڑے۔ گائیں۔ بیل اور بکریاں رکھتے تھے اور
 سوز۔ آم اور انگور وغیرہ کی کاشت کرتے تھے۔ پھول پوجا

اور بالوں کی زینت کے کام آتے تھے —

باہر کی دلبستگی کا سامان شکار تھا اور مکافوں میں لوگ گانے سنتے اور رقاصہ کے ناچ اور بازی گروں کے کرتبوں کو دیکھتے تھے۔ آدمی تھول۔ بانسری سنکھ اور بگل بجاتے تھے اور عورتیں ستار اور جھانجھ بجاتی تھیں رقاصاؤں کا وہی لباس تھا جو اب ہے اور بازی گر ناگوں کر چھوٹی اور چوڑی توکریوں میں لٹے پھرتے تھے۔ شراب خواری عام شغل تھا کیوں کہ ایرانیوں کی شراب خوری کے نظارے کے علاوہ تصویروں اور تراشی ہوئی مورتوں میں مستوں کے کئی گروہ نظر آتے ہیں —

—: 0 :—

اجنتہ کے غار لینا پور کی وادی میں نہایت خوشنما اور تنہا جگہ واقع ہیں یہ شہر اجنتہ سے مغرب و شمالی سمت چار میل پر ہیں اور فردا پور سے ساڑھے تین میل جنوب مغربی جانب ہیں۔ وہاں جانے کے لئے نزدیک کا مقام پاچوڑا جو جی۔ آئی۔ پی کا ریلوے اسٹیشن ہے وہاں سے اب ایک چھوٹی لائن جاتی ہے جو مہور تک پہنچا دیتی ہے۔ مہور سے فردا پور دس میل ہے۔ جہاں سے چند میل پر یہ غار ہیں۔ پہاڑیاں خاردار جھاڑیوں سے تھکی ہوئی ہیں اور دو پہاڑیاں جن کی چوٹیاں ہموار ہیں خاندیس کے میدان

میں ختم ہوتی ہیں۔ ایک پہاڑی ندی اُس ہموار پہاڑی تک جہاں غار واقع ہیں پہونچنے سے پیشتر اجنٹہ کے نزدیک دوسو فیت کی بلندی سے نیچے گرتی ہے۔ وہ سیدھا چٹان جہاں سے غار شروع ہوتے ہیں ۲۵۰ فیت بلند ہے اور وہ پہاڑی ندی اُس کے اطراف نصف دائرہ کی شکل میں بہتی ہے۔ کل ۲۹ غار ہیں اور سب کا تعلق زمانہ بادھ سے ہے۔ یہ غار تھای میل تک مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اُن کی بلندی ۳۵ سے ۱۰۰ فیت تک ہے۔ مشرقی جانب سے اگر شروع کریں تو ۸ سے ۱۳ تک نہایت قدیم غار ہیں۔ وہ غار ہالے اجنٹہ ہی ہیں جو ہندوستان کی قدیم اور قابل تعریف معماری سنگتراشی اور رنگ آمیزی کی یادگار ہیں اور زمانہ بادھ مت یعنی دوسری صدی قبل عیسوی سے ساتویں صدی عیسوی تک کے ہر قسم کی دستکاری کا دلچسپ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ یہ غار یکتائے روزگار ہیں اور اپنے زمانے کی عمارتوں کی خوب صورتی اور سنگتراشی کی عمدہ صنعت کو ظاہر کرتے ہیں۔ تصویریں ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا استرکاری کے کاغذ پر کھنچی ہوئی ہیں اور ہندوستان کی قدیم سوانتی کا آئینہ ہے —

سنگتراشی کے نمونے اپنی قسم کے بہترین نمونے ہیں اور اُنکا زیادہ تعلق مذہب سے ہے۔ مشرقی غاروں کے سامنے

دالان ہیں جنپر خوبصورت اور متفرق نقش کندہ ہیں لیکن ویہارا غاروں میں یہ نقش دروازوں دریچوں اور خانقا ہوں میں داخل ہونیکی جگہ پر ہیں۔ عورتوں اور مردوں کے مجسمے ہیں۔ جدید غاروں میں بغلی راستوں کی دیوار ہے۔ ستون اور مندر خوبصورت عورتوں اور عمدہ بیل بوتوں سے مزین، سبجے ہوئے ہاتھیوں، شکار گاہوں کے منظروں اور انسانی شکلوں سے منقش ہیں —

تصویروں کا منظر نہایت شگفتہ ہے اور ان سے زمانہ بدہ مت کے لوگوں کے خیالات و محسوسات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسکی قدر و منزلت سنگتراشی سے زیادہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تھام بدھ غاروں کی دیواریں چھت اور ستون تصویروں سے مزین تھے لیکن ۱۳ غاروں میں اب صرف انکی علامتیں رہ گئی ہیں اور نمبر ۱-۲-۹-۱۰-۱۶- اور ۱۷ میں رنگ آمیزی کے نامکمل حصے ہیں اور خاص طور پر دلچسپ ہیں۔ عورتوں کے نام سے اور حروف کے طرز تحریر سے جو بعض جگہ ہے پتہ چلتا ہے کہ تصاویر قدیمی دوسری صدی عیسوی کی ہیں اور نئی تصویریں ساتویں صدی کی۔ اکثر نظاروں کا تعلق تاریخ بدھ سے ہے۔ بدھ کا اشتنا سے ملنا۔ مرا کا اُسکو ترغیب دینا وغیرہ اکثر

تصویروں میں نمایاں ہے۔ کہیں وہ شاگردوں کو نصیحت کر رہا ہے۔ کہیں اُسکے معجزے۔ اندرا اور ساچی وغیرہ دکھائے ہیں۔ ایک تصویر میں وہ گنا سن رہا ہے تو دوسری میں بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا ہے۔ ایک جگہ کوئی راجہ ہاتھی سے اُتر کر اُس کی قدم بوسی کو جا رہا ہے تو دوسری جگہ کئی آدمی اور عورتیں اُس کی خدمت میں مصروف ہیں۔

ان غاروں سے ہندوستان کی مصوری کا کمال ظاہر ہوتا ہے اور اب بھی یورپ اور دیگر ممالک کے باکمال مصورانہیں دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔

سردار سنگھ

طالب علم عثمانیہ کالج
اورنگ آباد



عادات

خوشگوار نتائج سے مربوط ہونے پر بے تکی حرکتوں میں سے بعض جاری رہتی ہیں اور وہ حرکات جن سے کسی غرض کی تسکین نہیں ہوتی ترک ہو جاتی ہیں۔ وہ حرکات جو جاری رہتی ہیں انہی کے مجموعہ کا نام عادات ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ حرکات مذہباً یا اخلاقاً کیسی ہی ہوں۔ عادات یا تو کسی ہوگی یا فطری۔ فطری عادات اُسے کہیں گے جس کا میلان فطری ہو مثلاً مچھلی کے بچے میں تیرنے کی عادات یا آدمی کے بچے میں چلنے پھرنے بولنے کی عادات۔ اور کسی عادات وہ ہوتی ہے جس میں عادات پڑنے کا میلان تو موجود نہیں ہوتا لیکن عادات ایک کام کو ایک یا ایک سے زائد مرتبہ کرنے کی وجہ سے پڑ جاتی ہے مثلاً بندروں کا سدھائے جانے پر طرح طرح کے تماشے کرنا یا طوطے کا سکھانے پر ہمیشہ اور ہر شخص کو دیکھ کر میاں مٹھو بولنا۔

عادات کے کھوج کے متعلق اکثر تجربے کئے جاتے ہیں

ان میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ عادت کیونکر پڑتی ہے اور اس کے خصوصیات کیا ہیں۔ ایک تجربہ اسی تحقیق کے لئے بندر کے بچے پر کیا گیا۔ یہ بچہ ایک پنجرہ میں بھوکا رکھا گیا۔ پنجرہ کا دروازہ کھولنے کے لئے اس میں کی ایک کیل کا چھو دینا ہی کافی تھا جو کہ پنجرہ میں اسی غرض کے لئے لگائی گئی تھی۔ کھانا پنجرے کے باہر رکھ دیا گیا۔ بندر چونکہ بھوکا تھا کھانے کی چیزوں کو دیکھ کر ادھر ادھر کودنے لگا۔ کبھی ایک سلاخ کو پکڑتا تھا اور کبھی دوسرے کو اور یہ سب اس کی فطری ہرکتیں ہیں۔ اسی طرح کوشش کرتے کرتے تھک گیا۔ لیکن بھوکا تھا اس لئے اس کی کوشش جاری رہی۔ تھکنے کے باوجود بھی وہ ادھر ادھر ہاتھ مارتا رہا۔ اس کو بندر کی خوش قسمتی کہنا چاہئے کہ ایک مرتبہ اس کا ہاتھ اُس کیل پر پڑ گیا اور دروازہ کُھل گیا۔ دروازہ کُھلتے ہی بندر باہر نکلا۔ کھانا جو اس کے لئے باہر رکھا ہوا تھا کھایا۔ کھانا ختم ہونے پر اس کو پھر بند کر دیا گیا۔ دوسرے دن بھی پہلے دن کی طرح کھانا پنجرہ کے باہر رکھ دیا گیا۔ اس دفعہ بندر کی پہلے دن کی تھام بے تکی حرکتوں میں سے بہت سی بند ہو گئیں۔ سلاخوں کو پکڑ کر ادھر ادھر گودنا بند ہو گیا۔ صرف ایک کوشش جاری رہی یعنی دروازہ کے پاس ہی ادھر ادھر ہاتھ مارتا۔

اتفاقاً اس کا ہاتھ اس کیل پر پڑ گیا اور دروازہ کھلا۔ تیسری اور چوتھی مرتبہ کی کوشش کے بعد بندر کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ کھانا دیکھتے ہی اس کیل پر ہاتھ مارا کرتا تھا۔ یعنی دوسرے الفاظ میں یہ کہ وہ کھانا دیکھتے ہی ایک خاص قسم کی حرکت کرنے کا عادی ہو گیا تھا جس سے دروازہ کھلا کرتا تھا۔ یہ حرکت ایک خوشگوار نتیجہ سے مربوط ہوتے ہی ایک خاص قسم کے حرکت کے سبب سے عادت بن گئی تھی جو پہلے پہل بے تکی طور پر کی گئی لیکن جب کہ تین چار مرتبہ اس سے کامیابی ہوئی تو یہ حرکت راسخ ہو گئی اور وہ کھانا دیکھتے ہی اس خاص حرکت سے دروازہ کھولنے کا عادی ہو گیا۔

یہی حال انسانی دل و دماغ کا ہے۔ ایک ہارمونیم بجانے والے کی ابتدائی حالت اور اس کی حرکتوں پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلے روز کیسی بے تکی حرکتیں اس سے سرزد ہوتی ہیں۔ اگر دھوکنی چلتی ہے تو اس کی انگلیاں چلنی بند ہو جاتی ہیں اور جب انگلیاں چلنے لگیں تو سر بھی ہلنے لگا اور دھوکنی بند ہو گئی دوسرے تمام بے تکی حرکتوں میں سے بہت سی جاتی رہتی ہیں اور وہ ایسے راستہ پر لگ جاتا ہے جو خود خوشگوار معلوم ہونے لگتا ہے یعنی یہ کہ اسکا حرکتی نظام خوشگوار

نتیجہ سے مربوط ہو کر ایک خاص حرکت کا عادی ہو جاتا ہے —

عادت کی تعریف اور تجربوں پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں اس کی کتنی ضرورت ہے۔ بچے اوائل عمر میں کس طرح اور کن باتوں کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ان میں اچھی عادتیں ڈالنے کے لئے کیا کیا کرنا چاہئے۔ یہی بچپن کی بے تکی حرکتیں ہیں جن میں سے چند خاص جمع ہو کر عادت بن جاتی ہیں۔ عادت ہمارے افعال کے مجموعہ ہی کا نام ہے چند عادتیں مل کر اخلاق کہلاتی ہیں اور اخلاق جب عملی طور پر بڑتے جاتے ہیں تو سیرت ہوتے ہیں اور انہیں سے انسان کے اعلیٰ یا ادنیٰ ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن کی بے تکی حرکتیں مثلاً نقالی، تقلید وغیرہ آگے چل کر کس طرح سے سیرت کے جز بنتے ہیں —

آدمیوں میں تقلید کا مادہ بہت ہوتا ہے جب کبھی ایک آدمی کو کچھ کرتے دیکھتے ہیں اور وہ ان کو بھلا معلوم ہوتا ہو تو فوراً یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ ہم بھی ایسا کریں گے۔ بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو اس خیال کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بہت سے آدمیوں کا خیال وقتی اور عارضی ہوتا ہے ان خیالات کو عملی جامہ

پہنانا اُنہیں نصیب نہیں ہوتا۔ خاص کر بچپن میں تقلید بہت کام کرتی ہے۔ ہمیشہ بچہ دوسروں کو کچھ کرتے ہوئے دیکھ کر ویسا ہی کام کرنے لگتا ہے۔ اس کو کبھی اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ آئندہ چل کر یہ کیسا ثابت ہوگا بلکہ وہ جو کچھ کرتا ہے اضطراباً کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس قسم کی تقلید میں غرض شامل ہونے لگتی ہے یعنی تقلید خوشی یا دل بہلانے کے لئے کی جانے لگتی ہے اور یہی کام جو تقلید کے بنا پر کئے گئے تھے رفتہ رفتہ عادات بن جاتے ہیں اور عادات بڑھتے بڑھتے فطرت ہو جاتی ہے۔ اس کی تشریح مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب توبۃ النوح سے اچھی طرح ہو سکتی ہے جس میں فاضل مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ نظیر نصیحت سے بہتر ہے یعنی تقلید کے لئے نہ وہ پیش کرنا عادات دہانے کے لئے کتنا کارگر ہے۔

بعض اوقات عادات دہانے کے لئے کسی کام کا صرف ایک مرتبہ کرنا بھی کافی ہوتا ہے۔ جب کبھی کوئی کام ایک مرتبہ کیا جائے گا تو لازم ہے کہ اس کا خیال آتے ہی دوسری تیسری اور چوتھی مرتبہ کیا جائے گا۔ ذوق کا ایک شعر جو کہ شراب کے نسبت ہے اس حقیقت کے ایک رخ کو ظاہر کرتا ہے۔

اے ذوق دیکھ دختر رزکو نہ منہ لگا

چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

مولانا حالی کا شعر اس سے زیادہ خوبی کے ساتھ
اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔۔

چھتتے ہی چھتتے گا اُس گلی کا جانا

عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت (حالی)

اس کی مثالیں بے حس اشیاء میں بھی نظر آتی ہیں۔
ایک نئے قفل میں چابی کے پھرانے میں کتنی مشکل ہوتی
ہے۔ دوسری مرتبہ وہ مشکل ذرا کم ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ
قفل کے کھولنے اور بند کرنے کے لئے چابی آسانی سے پھرنے
لگتی ہے۔ یا ایک کاغذ کو دیکھو ایک مرتبہ وہ جہاں سے
مورا گیا دوسری مرتبہ اُس کو اس جگہ سے موزنے میں
دقت نہیں ہوتی بلکہ خود بخود وہ اس جگہ سے مرنے لگتا
ہے۔ یہی حالت انسانی دل و دماغ کی ہے یعنی جب انسانی
حرکتی افعال ایک کام سے مربوط ہو جاتے ہیں تو اس میں
انہی کے کرنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگتی ہے اور اگر وہ
کام جاری رہے تو رفتہ رفتہ وہ صلاحیت عادت سے
بدل جاتی ہے۔

وہی اور فطری میلان کی بنا پر بھی عادتیں پڑ جایا
کرتی ہیں اور عادتیں جو اس بنا پر پڑتی ہیں انکا چھڑنا
بالکل ناممکن ہو جاتا ہے مثلاً شیر کے بچہ میں حرکت کرتی
ہوئی چیز کو جھپٹ کر پکڑنے کی عادت یا بلی کے بچہ میں

حرکت کرتی ہوئی اشیاء کو جھپٹ کر پنجنہ میں پکڑنے کی عادت یا آدمی کے بچہ میں جو چیز ہاتھ میں آئے اسکو منہ تک لیجانے کی عادت۔ عادتیں زیادہ تر میلان کی بنا پر پڑا کرتی ہیں۔ اسکی تشریح اس ضرب المثل سے ہو سکتی ہے ” مچھلی کے جائے کن تیرائے “۔

کسی عادت کے تالنے کے لئے اس کے محرک کو کافی قوی کرنا چاہئے۔ یہ کہ ایک طالب علم جو کہ پڑھنے سے جی چراتا ہے اس کو پڑھنے کی عادت تالنے کے لئے ایسے اصول مرتب کرنا چاہئے جس سے وہ گریز نہ کر سکے اور اگر گریز کرے بھی تو اس کو اس چیز سے محروم کر دینے کا خوف دلانا چاہئے کہ اس کو بہت ہی پسند ہے مثلاً اس طالب علم کو امتحان میں کامیاب ہو جانے پر ایک خوشنما داوا دینا یا اس سے محروم کر دینا۔ ملازم ہمیشہ جو نوکر ہونے سے پہلے اس کام کے عادی نہیں ہوتے لیکن صرف اس خیال سے اگر کام نہ کریں تو تنخواہ میں کمی واقع ہوگی اپنے آپ کو اس کام کے عادی بنا لیتے ہیں۔ اس خوف کا خیال ملازم کو اس کام کا عادی بنا دیتا ہے یہ عادت ان میں محض اس لئے پڑتی ہے کہ اس کا محرک کافی قوی ہوتا ہے۔

کسی کام کی عادت تالنے کے لئے اسے لگاتار بار بار کرنے کی ضرورت ہے اگر اس میں خلل واقع ہوا تو عادت

کا قایم ہونا مشکل ہے مثلاً ایک طالب علم جو کہ رات میں دس بجے تک اور صبح چار بجے سے اُتھکر پڑھنے کا عادی ہو لیکن دو چار روز وہ کسی وجہ سے اس کی پابندی نہ کرے تو ظاہر ہے کہ اس کی عادت میں خلل واقع ہونے لگے گا۔ اول اول اس کو اس کے بدلنے پر کچھ تکلیف بھی ہوگی لیکن رفتہ رفتہ وہ اس عادت کا عادی ہوتا چلا جائے گا یہاں تک کہ اس کو اپنی پہلی عادت کے حاصل کرنے میں اسی تکلیف کا سامنا ہوگا جس کا پہلے ہو چکا ہے۔ یہ ایک بات کا ثبوت ہے کہ جسے ہم عام طور پر ترک عادت کہتے ہیں وہ بھی عادت ہی ہے اور ترک عادت میں وہی تھام ابتدائی دقتیں پیش آتی ہیں جو نئی عادت کے دالنے میں ہوتی ہیں۔

ان سب کے علاوہ کسی عادت کے دالنے کے لئے دوسری باتوں میں قوت ارادی سے کام لیتے رہنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً صبح اُتھنے کی عادت اگرچہ پڑھنے اور نہ پڑھنے سے متعلق نہیں ہے لیکن اگر طبیعت پر جبر کرے اُتھا جائے تو قوت ارادی مستقل رہیگی اور دوسری عادتوں کے دالنے میں آسانی ہوگی۔ اگر چند روز تک ارادی قوت کام میں لائی جائے تو وہ کام جو قوت ارادی کے تحت میں کئے جاتے تھے اب اضطراراً بغیر کسی جدوجہد کے سرزد

ہوئے لگتے ہیں۔ جیمس صاحب نے اپنی کتاب پرنسپل آف سائیکولوجی میں ایک فوجی اور مسخرہ کی مثال دی ہے یعنی فوجی اپنا کھانا لے کر سڑک سے جا رہا تھا۔ مسخرہ کو یہ دیکھ کر مسخرہ پن سوچا اس لئے اس نے زور سے ”اتینشن“ (Attention) کہا۔ فوجی نے اپنے دونوں ہاتھ فوراً قاعدہ کے موافق چھوڑ دیے۔ گوشت آلو وغیرہ جو وہ لئے جا رہا تھا نالی میں گر گئے۔ اب ظاہر ہے کہ ابتداء میں فوجی قوت ارادی کو کام میں لا کر اس حکم پر عمل کیا کرتا تھا اور جوں جوں وہ اس پر کار بند رہا وہ کام اضطراباً ہوتا گیا۔

جب انسان کسی بات کا عادی ہو جاتا ہے تو اس کے نتیجہ کی خوشگوا ری کم ہونے لگتی ہے یہاں تک کہ وہ سلب ہو جاتی ہے۔ کام محض ذاتی غرض کے لحاظ سے کیا جاتا ہے اس عادت کی طالب تسکین چاہنے لگتی ہے اور جب تک تسکین نہ ہو بے چینی رہتی ہے۔ مثلاً ایک شخص جو صبح اُتھکر ورزش کرنے کا عادی ہے تو ظاہر ہے کہ پہلے پہل اس کو اس عادت کے نالنے میں کچھ تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ تکلیف اُس کو اس لئے محسوس نہیں ہوتی ہے کہ محض یہ خیال کہ وہ آئندہ چلکر ایک پہلوان ہو گا یا صرف اس کا جسم اچھا رہیگا۔ اس میں عام لوگوں سے زیادہ طاقت ہوگی۔ کچھ دنوں

کے ورزش کرنے کے بعد اس کو لطف حاصل ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ لطف کم ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ ورزش کرنے کا عادی ہو جاتا ہے تو وہ لطف جو اُسکو ورزش کرنے بعد حاصل ہوا کرتا تھا غائب ہو جاتا ہے۔ غالب کا یہ مصرعہ عادت ہی کے اثر کو ظاہر کرتا ہے۔

مشکلین اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مختصر یہ کہ عادت کی اہمیت ہماری زندگی میں

بہت کچھ ہے۔ اگر ہمارے میلانات میں یہ خاصیت نہ ہوتی

کہ وہ مل جل کر عادت بن جائیں تو ہمارے ہر ایک کام

”ہنوز روز اول است“ کا مصداق ہوتے۔

محمد ایوب خاں

متعلم سینیر انٹرمیڈیٹ

عثمانیہ کالج اورنگ آباد



شہر کا نظارۂ شب

گھریالی نے تَن تَن دو بجائے —

شمع دم واپسیں لے رہی ہے۔ تہمتاتی ہوئی شمع
شمعدان کی پٹھلی ہوئی چربی کی وجہ سے کبھی مدھم
پر جاتی اور کبھی بھڑک اُٹھتی ہے —

نیند کے متوالے چوکی دار خواب غفلت میں ہیں —
دن بھر کے تھکے ماندے محنتی مزدور رات کو چین
پاکر میٹھی نیند سو رہے ہیں —

تخیل۔ ارتکاب گناہ۔ یاس و ناامیدی اور شغل بادۂ
نوشی نے بیداری کو زندہ کر رکھا ہے۔ بادۂ نوش جام پر
جام لٹھا رہے ہیں۔ چور چکار دے پاؤں شب گشت میں
مصروف ہیں۔ مرتکبان خود کشی اپنے ہی دست ناپاک سے
اپنی جان سیڑیوں مٹانے کے تہیہ میں ہیں۔ ایسے وقت میں
قدامت کے صفحات بوسیدہ کی ورق گردانی سے تضحی اوقات
کے سوا کچھ حاصل نہیں نہ ہمعصروں کے تار بود خیال میں
گرفتار ہونا مقتضائے دانشہندی ہے —

آو اس وقت اس سنسان راستے کی سپر کریں۔ جہاں
نخوت جو ہر آن نئے روپ بدلا کرتی ہے کچھ دیر پیشتر
مصروت خوش خرامی تھی اور نہو و نہایش کی گرم
بازاری کے بعد مچلنے والے بچوں کی طرح جو کبھی مطمئن
نہیں ہوتے اور اپنی خواہش بر آنے پر مجبوراً خاموش
ہو جاتے ہیں اب سرد مہری سے کام لیا جا رہا ہے۔

یہ کیسی افسردگی چھا ئی ہوئی ہے۔ بجھنے والی شمع
کی مدہم روشنی اپنی زرد کرنیں پھیلارہی ہے۔ گھڑی کی
تک تک یا کتوں کے بھوکنے کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں
دیتی۔ انسانی غرور و نخوت کی شورا شوری کا اب
وہ عالم نہیں رہا۔

ایسے ہی اوقات سے کبر و نخوت کی تہیدستی کا انکشاف
ہوتا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب ایسا ہنگامی سناتا
مداومت کا رنگ اختیار کر لے اور بسنے والوں کی طرح
خود بستی بھی نیست و نابود ہو کر اس کے بجائے صبرا و
بیابان کا منظر پیش نظر ہو۔

کوی ایسا شہر نظر نہ آئے گا۔ جو اسی طرح اپنی عظمت۔
فتوحات و لامحدود شادمانی میں ہمیشہ ہمیشہ شہرۂ
آفاق رہا ہوا اور کوتاہ اندیشی کے باوجود ان مت
ثابت ہوا ہو۔

اخلاص ایسی بستیوں کے کھوج لگانے سے عاجز ہیں۔
 دل گرفتہ مسافروں کا اکثر و بیشتر ایسے ویرانوں میں
 گزر ہوتا ہے اور ایسے مقامات کو دیکھ کر اُن کی آنکھیں
 گھلتی اور اگلے زمانہ کی عارضی و ناپائدار مقبوضات کی
 قلعی گھلتی ہے۔

یہاں ایک زمانہ میں کوہ وقار قلعہ تھا۔ جس کی
 دیواروں سے بوسیدگی کے آثار نمایاں ہیں۔ اس جگہ کسی
 قوم کا دارالشوریٰ تھا جو اب زہر آلود کیرے مکوڑوں
 کا مسکن ہے۔ کہیں معابد و تہاشا گاہیں تھیں۔ جو اب بعض
 تودہ خاک ہیں۔ یہ سب مقامات شکست و مسہار ہو چکے۔
 کیوں کہ حرص و تعیش نے پہلے ہی اُن کی بنیاد کھوکلی
 کر دی تھی۔

بجائے اس کے کہ حکومت کا آمد اشخاص کی حوصلہ
 افزائی کرتی صرف دل خوش کن افراد کی قدردانی پر
 وہ مائل رہی۔ ایسے مہالک کی دولت و ثروت نے حملہ
 آوروں کی توجہ اپنی جانب منعطف کرای اور گو انہیں
 شروع میں پسپائی نصیب ہوئی۔ لیکن استقلال نے فتحہندی کا
 سہرا اُن ہی کے سر باندھا اور مدافعت کرنے والوں کا نام
 و نشان صفحہ ہستی سے اس طرح مٹ گیا کہ اُس کی
 نظیر ملنی مشکل ہے۔

جن گلی کوچوں میں چند گھنٹے قبل چہل پہل ہو رہی تھی اب وہاں بہ مشکل اکا دکا نظر آتا ہے۔ جو لوگ نظر آتے ہیں اب وہ اپنی روز مرہ کی بناوٹ سے عاری ہیں اور اس وقت کوی کوشش اپنی مصائب و الم کے اخفا کی نہیں کرتے —

فرش خاک پر آرام کرنے والی کون ہستیاں ہیں؟ جو پیت بھروں کے دروازوں پر سر رکھ کر اپنی بدبختی کو تھوڑی دیر کے لئے بھولی پڑی ہیں —

یہ لوگ یا تو اجنبی ہیں یا آوارہ وطن یا یتیم و بیگس جن کی حالت زار لا علاج مرض ہے اور جن کی زبوں حالت اس درجہ پست ہے کہ کسی ہمدردی کی انہیں ترقح نہیں۔ اُن کی حالت پر بجائے رحم کے روٹکتے کھڑے ہوتے ہیں۔ بعض بالکل تن بربنہ ہیں جن کے جسم پر ایک چیتھڑا بھی نہیں۔ بعض مبتلاے امراض ہیں۔ دنیا والوں نے اُن سے بالکل بے تعلقی کر رکھی ہے۔ خوشحال افراد نے اُن سے نظر پھیر لی ہے اور انہیں برہنگی و گرسنگی میں آلودہ چھوڑ دیا ہے —

ان فنگی بھوکی ہستیوں میں کچھ ایسی بھی ہیں جنہوں نے اچھے دن دیکھے تھے اور کبھی اُن کے حسن و جمال کا نہ نکا بچتا تھا۔ عیاشوں کی بد افعالیوں نے انہیں اس درجہ

پر پہونچا دیا کہ وہ اب تن عریاں موسموں کے مصائب و
 آلام برداشت کر رہی ہیں۔ اس وقت شاید وہ انہیں
 عیاشوں کے دروازوں پر پڑی اپنی حالت زار پر اُن کی
 توجہ مبذول کرانے کی کوشش میں ہیں جنہوں نے کسی
 زمانہ میں ان کی عصمت ریزی کی تھی اور اُن کے جو بن کے
 مزے لوٹے تھے۔ لیکن اب اُن سنگ دلوں میں کوئی احساس
 باقی نہیں رہا یا ان بادۂ فوشوں کے پاس اپنی حالت زار کا
 اظہار کرنے آئے ہیں جن سے سوائے لعن طعن کے کسی امداد
 کی توقع نہیں ہو سکتی —

افسوس میں کیوں ایسا افسانہ پیدا ہوا جو ان مبتلاۃ
 آلام کی مصیبت دیکھتا ہوں اور اُن کی امداد کرنے سے
 عاجز ہوں۔ غریب خانمان برباد ہستیاں! اہل دنیا ان پر
 لعن طعن کرنے میں تو کوتاہی نہیں کرتے لیکن دست امداد
 دراز کرنے سے دست کشی کرتے ہیں —

بڑے لوگوں کی ذرا سی تکلیف یا امرا کی فرضی
 پریشانی کا طومار باندھا جاتا ہے اور اس طرح مبالغہ
 آمیز طور پر اُن کا اظہار کیا جاتا ہے کہ جذبات ہمدردی
 و توجہ خواہ مخواہ اُن کی جانب منعطف ہوتے ہیں۔ بیچارے
 غریب دکھیارے روتے ہیں اور کوئی شنوائی نہیں ہوتی
 ظالموں کے چیلے چا پڑے اُن کی ایذا رسانی میں کوئی

دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے اور ہر قسم کے قوانین جو اور
دوسروں کی حفظ و اماں کا بیڑا اُٹھائے ہوئے ہیں ان
مظلوموں کے جانی دشمن ہیں —

مرا دل خدا نے کیوں ایسا بنایا کہ ایسی حالتوں سے
اس پر تھیس لگتی ہے۔ کیوں میری قسمت ایسی نہ ہوئی کہ
دل کی ہوس پوری ہوتی۔ نرم دلی جو مصیبت دور کرنے
سے عاجز ہو اُس شخص کو جس کا دل ایسی حالتوں سے
موثر ہوتا ہو حاجت مند سائل سے زیادہ دل گرفتہ
بنا دیتی ہے — خدا حافظ

افضل حسین فاروقی

(گولڈسمتھ)



اخبارِ کلیہ

وظایف تعلیمی | یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ موجودہ زمانہ میں اعلیٰ تعلیم کے اخراجات اس

قدر بڑھے ہوئے ہیں کہ اس سے فائدہ اٹھانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے اور اکثر اسی وجہ سے بہت سی ہونہار طبیعتیں ابھرنے نہیں پاتیں اور ملک و قوم کو ان کی فطری ذہنی صلاحیتوں سے پوری طرح فیض پانے کا موقع نہیں ملتا۔ اسی وجہ سے امدادی اور تعلیمی وظائف آج کل ہر جدید ادارہ علمی کا جز و لازم ہوتے ہیں۔

ہمارے کالج کو قائم ہوئے اگرچہ بہت زمانہ نہیں گزرا۔ لیکن سرکار عالی کی علم پروری اور مخیر الطبع اصحاب کی طلبا نوازی کی بدولت اس تھوڑے سے عرصہ میں ہمارے یہاں وظائف کی اچھی خاصی تعداد فراہم ہو گئی ہے اور حیدرآباد جیسے شہر کے مقابلے میں ہمارے حلقہ عمل کی تنگی کو دیکھتے ہوئے جو کچھ بھی ہوا یقیناً ہمت افزا ہے۔

اس ضمن میں ہم خاص کر نواب عہد الملک مدظلہ کے نہایت شکر گزار ہیں۔ بہت کم اصحاب کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کالج کے قیام کے اصل محرک نواب صاحب مہدوح

ہی ہوئے اور انہیں کی بدولت اورنگ آباد کو یہ برکت حاصل ہوئی۔ نواب صاحب ابتدائے قیام کالج سے بیس روپیہ ماہانہ وظائف عطا فرما رہے ہیں۔ نواب صاحب کو اورنگ آباد کی تعلیمی حالت اور یہاں کی حرفت و صنعت کا خاص خیال ہے اور ہمیشہ اس کے متعلق دریافت فرماتے رہتے ہیں۔

ہم مسٹر بیزن جی فریدونجی کی فیاضی اور طلبا نوازی کے بھی بہت مہندوں ہیں۔ مسٹر بیزن جی ہر نیک اور مفید کام میں مدد دینے کے لئے ہمیشہ آمادہ رہتے ہیں۔ طلبا دور دور سے ان کا نام سن کر امداد کے لئے آتے ہیں اور ان کی فیاضی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کالج کو وہ پینتیس روپیہ ماہانہ کے وظائف دے رہے ہیں۔ مسٹر بیزن جی در حقیقت فخر جائفہ ہیں۔

وظائف کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

مقدار ماہانہ	تعداد	وظائف	سرکاری وظائف
۸۰ روپیہ	۸ (فی ۱۰ روپیہ)	سال اول	
۸۰ روپیہ	۸ (فی ۱۰ روپیہ)	سال دوم	
۲۰ روپیہ		عالی جناب نواب عماد الملک بہادر	
۳۵ روپیہ		جناب مسٹر بیزن جی فریدونجی	
۶۰ روپیہ		پرنسپل و پروفیسران کالج	

صوبہ اورنگ آباد کے ناظم عدالت حاجی رفیع اسکالرشپ |
معتمد رفیع صاحب کے تبادلہ کے وقت

وکلاء ان کے احباب اور ماتحت اصحاب نے وداعی دعوت کے لئے کچھ رقم جمع کی تھی۔ پرنسپل صاحب کی تحریک پر ان تھام اصحاب نے نیز حاجی صاحب نے اپنی عنایت سے یہ منظور فرما لیا کہ یہ تھام رقم اورنگ آباد کالج کو دیدی جائے۔ اگر رقم کافی ہو تو اس کی آمدنی سے حاجی صاحب کے نام سے وظیفہ مقرر کر دیا جائے ورنہ انعام یا تمغہ کا انتظام کر دیا جائے۔ افسوس ہے کہ اس تجویز کا خیال ایسے وقت میں آیا کہ حاجی صاحب کے جانے میں صرف چند ہی روز باقی رہ گئے تھے ورنہ غالباً چندہ میں کافی اضافہ ہو جاتا۔ تاہم اورنگ آباد۔ جالندہ اور نانڈیڑ سے جو رقم وصول ہوئی اس کی تفصیل لکھی جاتی ہے۔ اگرچہ نانڈیڑ میں سب سے آخر میں کوشش کی گئی لیکن سب سے زیادہ رقم وہیں سے وصول ہوئی جس کے لئے ہم میر باسط علی خاں صاحب ناظم عدالت ضلع اور مولوی ثابت علی صاحب عباسی منصف نانڈیڑ کے مہنوں ہیں۔

۱۔ اورنگ آباد ۴۰۶ روپیہ حالی

۲۔ جالندہ ۸۵ روپیہ حالی و ۵۰۰ روپیہ کلدار

۳ نانڈیڑ ۱۰۰۴ روپیہ حالی

چنانچہ انتظامی مجلس کے راء سے جس میں شهر کے سربرآوردہ وکلا اور عہدہ دار شریک ہیں یہ طے پایا کہ اس رقم سے انجمن ہائے اتحادی کے مرکزی بنک (اورنگ آباد) کے حصص خریدے جائیں اور ان کی آمدنی سے کالج کے مستحق طالب علم کو وظیفہ دیا جائے۔ وظیفہ کا دینا پرنسپل اور اُن کے پروفیسر کی راء پر چھوڑا جاتا ہے۔

کالج کی انجمنیں | نصاب تعلیم کی پابندی اور انتظامی قیود کے علاوہ ہر کالج میں اس قسم کی انجمنوں کا وجود بہت کچھ ضروری ہے۔ علمی فوائد کے علاوہ صحیح معنوں میں طلباء کی سیرت کے بنانے میں مدد دینے والی اور انہیں زندگی کی ذمہ داریوں کے لئے تیار کرنے والی یہی داخلی جماعتیں ہوتی ہیں۔ ہمارے کالج میں اب تک حسب ذیل انجمنیں قائم ہو چکی ہیں اور بہت کچھ کامیابی کے ساتھ چل رہی ہیں۔

یہ انجمن مباحثہ ہے۔ اس کے صدر اور | College Union
معتد کا انتخاب طلباء کی جماعت سے کیا جاتا ہے۔ دونوں کی مدت عہدہ ایک سال ہے۔ اس انجمن کے جلسے دو ہفتے میں ایک مرتبہ ہوتے ہیں اور انگریزی میں مباحثے ہوتے ہیں۔ ابھی تک طلباء کی جھجک پورے طور

پر نہیں نکلی ہے اور مقرریں کو آمادہ کرنے کے لئے بہت کچھ ترغیب کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن آئندہ کے لئے اس انجمن کی ذات سے بہت کچھ امیدیں وابستہ ہیں۔ اس انجمن کی سرپرستی میں اکثر باہر کے اصحاب کی تقریریں بھی ہوتی ہیں۔ اس سال حسب ذیل اصحاب نے اپنے خیالات سے طلباءے کلیہ کو مستفیض فرمایا۔

(۱) مسٹر آیر مختصر نویسی

(۲) پروفیسر کروے بائی تعلیم نسوان پونہ زنانہ

جامعہ نسوان پونا یونیورسٹی

ہئیت انتظامی کے اعتبار سے یہ بزم College
بزم اردو Union کی طرح ہے۔ لیکن اس میں مباحثے اردو

میں ہوتے ہیں اور ان میں بہت کچھ دلچسپی ظاہر کی جاتی ہے۔ اس انجمن کے صدر ہمارے پروفیسر دینیات مولوی منظور معہد صاحب ہیں۔ معہد کا انتخاب طلبہ میں سے ہوتا ہے۔ اس کے جلسے بھی پندرہویں روز ہوتے ہیں۔ اس انجمن کی سرپرستی میں بھی باہر کے اصحاب کو مدعو کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سال گزشتہ جناب حافظ ساجد علی صاحب عباسی وکیل ہائی کورٹ اورنگ آباد نے ریاست حیدرآباد کی ملکی صنعتوں کا بیان اور ان کی ترقی کے امکانات پر ایک مبسوط تقریر فرمائی۔ یہ جلسے عام

ہوتے ہیں۔

کھیل | علمی انجمنوں کی طرح کھیل کا انتظام بھی ہر کالج کے لئے ضروری ہے۔ بڑے بڑے کالجوں میں خاص اس مد کے لئے بڑی بڑی رقمیں منظور کی جاتی ہیں اگرچہ بد قسمتی سے اس وقت تک ہمارا کالج اس سرکاری امداد سے محروم ہے جس کا بحیثیت کالج ہونے کے وہ مستحق ہے تاہم یہ امر نہایت قابل اطمینان ہے کہ پہلے سے ہی اسکول اور فوقانیہ عثمانیہ میں کھیلوں کا شوق چلا آ رہا ہے اور اب ان کے کالج میں ضم ہونے سے یہ شوق اور بڑھ گیا ہے۔ اورنگ آباد ٹورنمنٹ سابق مدرسہ فوقانیہ کی زیر پرستی کئی سال سے بہت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اور سالانہ مقابلہ اس کے ہر دل عزیز معتمد محمد ابراہیم صاحب ایم۔ اے لکچرار کی فکرائی میں بہت کچھ فروغ ہوا ہے۔ کالج کے قیام کے بعد سے اس میں کریکٹ کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس ٹورنمنٹ کی رونق سال بہ سال بڑھتی جائیگی اور اورنگ آباد کی پبلک اپنی اس قابل فخر چیز کو ضائع نہ ہونے دے گی۔ انسانوں کی طرح اداروں (Institutions) کی بھی جان ہوتی ہے۔ ضد اور

مخالفت کی وجہ سے وہ بھی مر جاتے ہیں۔

معمولاً ہمارے کالج میں حسب ذیل کھیلوں کا انتظام

ہے جو تقریباً طلباء کے ہاتھ میں ہے —

کریکت

ہاکی

فٹ بال

بیڈمنٹن

ٹینس

تفریح | تورنمنٹ کے آغاز کے وقت سے اب تک ہر سال اس موقع پر ایک ڈراما ہوا کرتا تھا۔ بدقسمتی

سے ہمارے مروجہ اردو ڈرامے کچھ اس قدر بدمزہ ہوتے ہیں کہ عام طور پر لوگوں کو کسی کالج یا مدرسہ کے ساتھ اس کا تعلق گوارا نہیں ہوتا۔ اُمسال ہم نے اس میں یہ تبدیلی کی ہے کہ بجائے ڈرامے کے سالانہ جلسے کے موقع پر ایک جلسہ نظم خوانی کا ہوا۔ اس کا پروگرام بہت کچھ دلچسپ تھا اور عام طور پر پسند کیا گیا۔ آئندہ کے لئے خیال ہے کہ چیدہ ڈرامے کافی مشق کے بعد کئے جائیں تاکہ پبلک کا مذاق بھی درست ہو اور خون ڈراما کرنے والوں میں ادب عالیہ کی اس اہم شاخ کی طرف سے دلچسپی پیدا ہو۔

—:O:—

اس سال ہمارے کالج کے طلباء جناب سیر (Excursion) | پرنسپل صاحب اور دو لکچرار صاحبان

کے ہمراہ ایجنٹہ کے غاروں کے دیکھنے کے لئے گئے۔ تھیرنے وغیرہ کا انتظام قبل از قبل کر لیا گیا تھا۔ ایجنٹہ کے قابل مہتمم مواری سید احمد صاحب کی عنایت سے یہ سفر بہت کامیاب رہا خوب غور کے ساتھ اس قدیم یادگار کے چپہ چپہ کی سیر کی گئی اور عام سیالگوں کے دستور کے خلاف ہر چیز کو نئی اور تاریخی اعتبار سے دیکھنے اور سمجھنے کے کی کوشش کی گئی۔ ہمیں امید ہے کہ نئے سال تعلیمی کے آغاز میں ہمارے طلباء دیگر قابل دید مقامات کا سفر کر سکیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے اورنگ آباد میں سیر کے قابل مقامات کی کمی نہیں ہے۔ صرف چشم بینا اور اثر قبول طبیعت کی ضرورت ہے —

”دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز“

پہلے اورنگ آباد میں دو بورڈنگ ایک اقامت خانے | دوسرے سے علیحدہ تھے۔ ایک مدرسہ فوقانیہ کا اور دوسرا ہائی اسکول کا۔ بعد میں دونوں ضم ہو گئے تھے۔ اب فوقانیہ بورڈنگ علیحدہ ہے اور اس میں انٹرینس اور سکستھ فارم تک کے طلباء رہتے ہیں اور کلیہ عثمانیہ کا علیحدہ۔ اس بورڈنگ کی عمارت بھرکل دروازے سے ملی ہوئی ہے۔ سردست ایک مکان کرایہ پر لیا گیا ہے جو وقتی ضروریات کے اعتبار سے ضرور کافی ہے لیکن آئندہ کی

ضرورتوں کے لئے شاید کفایت نہ کرے۔ ہم اس خاص مد میں حیدر آباد کے جگہگاتے ہوئے اقامت خانوں کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے لیکن یہ کوشش ضرور ہے کہ جائز آسائش اور حقیقی تعلیمی سہولتوں کے اعتبار سے ہمارا پورے ہر طرح سے کامیاب ثابت ہو۔

لوگ عام طور پر Self Government (خود	انتظامی حیثیت سے کالج میں طلبہ کی ذمہ داریاں
انتظامی) کو صرف مدارس ثانویہ کے لئے موزوں سمجھتے ہیں اور کالجوں کے سلسلہ	

میں اس کا نام نہیں سنا جاتا۔ لیکن چونکہ ہمارے کالج کی ایک خاص نوعیت ہے اور جماعتہائے فوقانیہ اس کا بڑا جز ہیں اس لئے ہم نے بھی اپنے طلباء میں ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کی غرض سے کچھ داخلی عہدہ دار مقرر کئے ہیں۔ یہ عہدہ دار سب کے سب طلباء ہوتے ہیں اور جماعتیں ان کا انتخاب کرتی ہیں۔ ہمارے ہاں حسب ذیل عہدہ دار ہیں۔۔

نائب صدر یونین احمد حسین قدوائی سال دوم

” بزم اردو ”

مستند یونین سردار سنگھ سکستھ فارم

” بزم اردو ”

کپتان ہاکی ایوب خان سال دوم

کپتان فت بال	عبدالمہ	سال دوم
سکریٹری ٹینس	رضی الدین	سکستھ فارم
پولس کھشنر	عبدالحفیظ	سکستھ فارم

ان عہدہ داروں سے حسب ضرورت رائے لی جاتی ہے اور چون کہ ہمارے طلباء اپنی ذمہ داری کا کافی احساس رکھتے ہیں اس لئے مرکزی اور داخلی انتظام میں تصادم کا کوئی احتمال نہیں ہے۔

یہ دارالہطالعہ پبلک حیثیت رکھتا ہے۔ اسے دارالہطالعہ _____ قائم ہوئے ایک سال ہو چکا ہے۔ جناب صدر صاحب کلیہ کی تحریک پر شہر کے مخیر الطبع اور علم دوست حضرات نے یکمشت امداد اور ماہانہ چندوں سے اسے قائم کیا ہے۔ اس میں ہمارے ملک کے اردو-انگریزی اور مرہٹی کے بہترین اخبارات و رسائل آتے ہیں۔ ایک فارسی اخبار حبل المتین اور ایک فارسی رسالہ ایران شہر بھی آتا ہے۔ یہ دارالہطالعہ ۵ بجے شام سے رات کے ۸ بجے تک کھلا رہتا ہے۔ چونکہ ابھی رقومات چندہ بر وقت وصول نہیں ہوتی ہیں اس لئے روشنی کا انتظام دارالہطالعہ کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے بہت زیادہ قابل اطمینان نہیں ہے لیکن یہ دقت بہت جلد رفع ہو جائے گی۔

ہمیں امید ہے کہ یہ دارالہطالعہ شہر کا علمی مرکز بنے گا

اور اس کی کرنیں کلیہ کی چار دیواری کے باہر بھی پھیلیں گی اور عوام الناس کے سینوں کو منور کریں گی۔ اس کی کامیابی کا گل و جزا انحصار پبلک کی مدد اور علم دوستی پر ہے اور ہمیں امید ہے کہ ان دونوں چیزوں سے دریغ نہ کیا جائے گا —

بخوت طوالت ہم اس موقع پر اخبارات و رسائل کی پوری فہرست درج نہیں کر سکتے صرف مختلف زبانوں کے رسائل اور اخبارات کی تعداد دی جاتی ہے —

رسالہ	اخبار	
۵	۴	انگریزی
۹	۶	اُردو
۱	—	ہندی
۲	۱	مرہٹی
۱	۱	فارسی
۱۸	۱۲	

پور فنڈ | اس کی اہمیت کا اندازہ صرف وہی تعلیم گاہیں لگا سکتی ہیں جو شہروں سے دور مضافات میں واقع ہیں اور جن میں نادار طلباء کی کثرت ہوتی ہے۔ ہمارے کالج میں اس فنڈ کی خاص طور پر ضرورت ہے۔ اس سے اگر ایک طرف طلباء میں ایک دوسرے کی مدد کا

خیال پیدا ہوتا تو دوسرے طرف غریبوں کی تعلیم کا
 انتظام بھی ہوتا ہے۔ اس فنڈ کی کامیابی کا سہرا زیادہ
 تر اس کے ہر دل عزیز سکرٹری مستروی۔ رامچندر بی۔ اے۔
 بی۔ تی اور مولوی نواب الدین صاحب شریک معتمد کے
 سر ہے۔

اس موقع پر ہم اورنگ آباد کے ہر دل عزیز اول تعلقدار
 مولوی محمد رضا صاحب کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتے
 ہیں جو اس مد میں دس روپیہ ماہانہ سے امداد
 فرماتے ہیں۔
 ذیل کے اعداد سے معلوم ہوگا کہ اس فنڈ کی حیثیت
 (سرمایہ اور امداد کے لحاظ سے) سال گزشتہ کیا تھی، اس
 فنڈ کے سرمایہ سے ایک مکتبہ بھی قائم ہے، جو نادار طلبا
 کو مفت کتابیں دیتا ہے۔



پور فنی

چٹھا بابتہ سنہ ۳۳ ت

(از یکم فروردی سنہ ۳۳ لغایت ۳۰ آبان سنہ ۳۳)

آمد

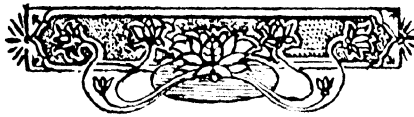
مدات	روپیہ	آفہ	پائی
امداد از عالی جناب معتمد رضا صاحب اول تعلقدار اورنگ آباد۔	۸۰	۰	
امداد از پرنسپل صاحب و استئات و طلبا کالج۔	۳۰۳	۹	۶
از فروخت روشنائی و فیس امتحان۔	۹۵	۳	۱۰
کل میزان	۳۷۹	۱۳	۴
خرچ	۳۷۸	۱۱	۴
نقد بدست	۱	۲	۰

خرچ

مدات	روپیہ	آفہ	پائی
وظائف و خریدی کتب۔	۴۰۲	۹	۰
ربر مهر۔	۴	۲	۰
کاغذ۔	۰	۱۳	۰
خریدی کاغذ برائے امتحانات۔	۷۱	۳	۴
میزان	۳۷۸	۱۱	۴

یکم آذر سنہ ۳۴۰ ف تک مکتبہ کی مد سے ۲۹۹ روپیہ ۵ آنہ
۶ پائی کا منافع ہوا جس میں سے ۱۵۰ روپیہ سرمایہ محفوظ
میں داخل کر دیا گیا اور ۱۴۹ روپیہ ۵ آنہ ۶ پائی پورفندہ
میں منتقل کر دیا گیا۔ مکتبہ میں آٹھ سو روپیہ قیمت کی
کتب موجود ہیں۔ سال گزشتہ کل طبقہ کالج و وسطانیہ
میں ۱۸۷ طلبا کو کتابیں تقسیم کی گئیں جن کی مجموعی
تعداد ۴۸۶ تھی۔

مذکورہ بالا مختصر کیفیت سے واضح ہوگا کہ ہمارے
مدرسہ کے اساتذہ و طلبا ”اپنی مدد آپ کرو“ کے زریں
اصول پر کس حد تک کار بند ہیں۔



نتائج امتحانات | خوشی کی بات ہے کہ امسال ہمارے ہاں
 کے نتائج ہر اعتبار سے بہت اچھے رہے
 خصوصاً ہائی سکول لیونگ سرٹفکیٹ و ایف اے کے نتائج
 مہالکہ محروسہ سرکار عالی میں بہترین ہیں اور ہمارے
 ایف-اے کے دو طلبا کلکرنی صاحب و احمد حسین صاحب
 قادری کو علی الترتیب مضامین سنکرت و دنیات جامعہ میں
 اول رہنے کے صلے میں ۲۰ ماہانہ کا وظیفہ ملا ہے افسوس
 ہے کہ ہم بغوث طوالت کامیاب امیداروں کی مفصل فہرست
 شایع نہیں کر سکتے اور صرف ذیل کے اعداد پر اکتفا کی
 جاتی ہے۔ ہم ان سب طلبا کی خدمت میں دلی مبارکباد
 پیش کرتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ یہ حضرات کامیابی کے
 فوری جوش سے متاثر ہو کر تعلیم کے اعلیٰ ترین مقاصد کو
 نظر انداز نہ کریں۔ بلکہ اسی طرح صدق خلوص اور احترام
 کے ساتھ طلب علم میں لگے رہیں۔ بقول تے نی سن :

Let knowledge grow from more to more,
 But mere of Reverence in us dwell;
 That mind and soul according well,
 May make one music—as before.

کیفیت	تعداد کامیاب شدگان				تعداد لڑکا	امتحان
	جملہ	سوم	دوم	اول		
ایک اور طالب علم گروپ میں کامیاب ہوا ہے	۱۲	۶	۶	۰	۱۶	ایف-۱ے
درجہ اول میں کامیاب طالب علم سہیت راے مہا لک محروسہ میں دوم ہیں	۲۶	۱۶	۹	۱	۲۸	H.S.L.C.
درجہ اول میں کامیاب علی بن غالب مہا لک محروسہ میں چہارم ہیں۔ ۸ اور طلبا گروپ میں کامیاب ہیں—	۱۲	۶	۵	۱	۲۳	میٹرک
	۸۳	۷۳	۹	۱	۱۱۰	مدل
	۱۳	۰	۰	۰	۱۷	ایلمنٹری ڈرائنگ
	۷	۰	۰	۰	۱۲	انٹرمڈیٹ ڈرائنگ

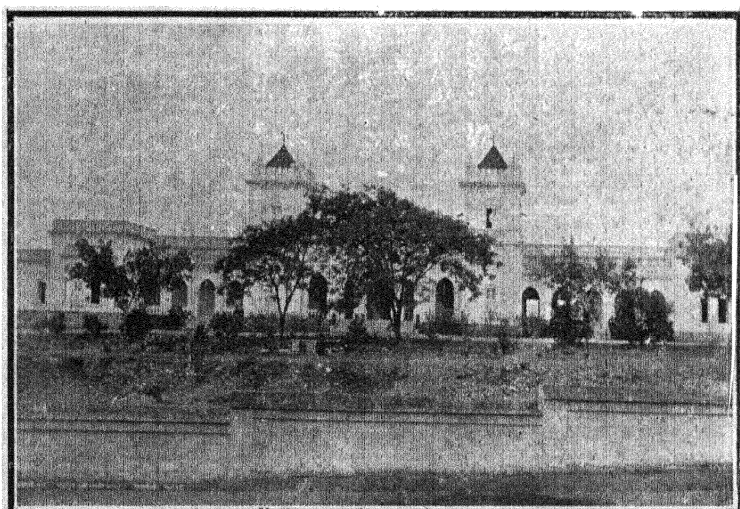
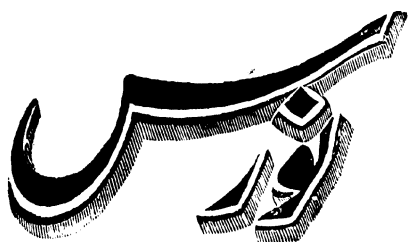
افسوس ہے کہ ہمارے یہاں میٹرک کے چار طلبا امتحان سے تین روز قبل کھی حاضری کے مغالطے کی وجہ سے خانگی کر دئے گئے یہ چاروں کامیاب ہوئے ہیں اور ان میں سے ایک افتخاراو صاحب درجہ اول میں پاس ہوئے ہیں۔
مذکورہ بالا فہرست میں ان کا شمار نہیں کیا گیا ہے۔



نمبر

نومبر سنہ ۱۹۲۵ ع

جلد



اوزنگ آباد کالج کا دو ماہی رسالہ

انجمن اُردو کے مطبع میں چھپا

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	شذرات	آدیٹر	۱
۲	تاریخ کی تعلیم کا مدعا کیا ہے	جناب سید ہاشمی صاحب فرید آبادی رکن دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ	۱۲
۳	خطبہ امیر جامعہ بمقریب جلسہ تقسیم اسناد فضیلت	عالمی جناب نواب ولی الدولہ بہادر جامعہ عثمانیہ	۱۹
۴	بھٹکی ہوئی نیکی	حضرت شبیر حسن جوش ملیم آبادی رکن دارالترجمہ	۲۸
۵	من کی موج	من - موجی	۳۲
۶	داس بھٹیٹ شاعر	از گوکل داس صاحب متعلم سال دوم ایف۔ اے اورنگ آباد کالج	۳۶
۷	”عذر گناہ“	آدیٹر	۴۵
۸	نکاح بالجبر (ڈراما)	مریمہ جناب پروفیسر وہاج الدین صاحب	۴۹
۹	اخبار علمیہ	آدیٹر	۹۰
۱۰	اخبار کلیہ	آدیٹر	۹۶

شذرات

نورس کا پہلا نمبر ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچ چکا ہے، خوشی کی بات ہے کہ ادبی دنیا نے اس نومولود کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور ہماری عزت افزائی کی، ہم ان سب قدردانوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے تبصروں اور خطوں کے ذریعہ اظہار خیال فرمایا اور بعض مفید مشورے بھی دئے۔ جیسا کہ ہم پہلے نمبر میں عرض کر چکے ہیں، نورس کو کسی قسم کا دعویٰ نہیں، نہ تو وہ ”مجلہ علمیہ و ادبیہ“ ہے اور نہ ”علمی، ادبی، تاریخی، تجارتی رسالہ“ ہمیں امید ہے کہ دعویٰ کی یہ کمی ہی اس کی درازی عمر کی کفالت کرے گی اور ہمارا یہ چھوٹا سا سفینہ بحر ادب کے مد و جزر کو اچھی طرح برداشت کر لے گا۔

بگزار کہ این نسخه معجزی ماند

نورس کے اجراء کو ابھی تین ہی مہینے ہوئے ہیں لیکن اس تھوڑی ہی سی مدت میں ہمارے کلیہ کے نوںہالوں میں جو روح پیدا ہو گئی ہے وہ یقیناً اُمید افزا ہے، مضمون نویسی اور ترجمے کا شوق پیدا ہو چلا ہے، اگر

پہلے ہمارے طلباء اخباروں اور رسالوں کو سرسری طور پر پڑھتے تھے، تو اب ایک خاص مقصد کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، مشورے لیتے ہیں، کتب اسناد دیکھتے ہیں، نظمیں لکھ لکھ کے لاتے ہیں، موقع نہ ملنے سے جو صلاحیتیں دب گئی تھیں وہ اب سطح پر آ رہی ہیں اور ابھر نے کی کوشش کرتی ہیں، اگر یہ حالت مستقلاً پیدا ہو گئی تو ہم سمجھیں گے کہ ہمارا یہ ”فارس“ سپہل ہوا۔ کسی کلیہ کے رسالہ کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ مختلف اور متفرق معلومات کی ایک کھٹونی ہو، اس کا بڑا لوازمہ تحریر کی قوت ہے، ذوق جستجو کو اشتعال دینا جودت طبع کو اُکسانا یہی اس کا ’مہاکاج‘ ہے، اس کی کامیابی کی جانچ اسی کسوٹی پر ہوتی ہے —

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے کلیہ نے اپنی زندگی کے پہلے دو سال بخیر و خوبی اور بہت کامیابی کے ساتھ ختم کرائے ہیں، خواہ نتائج امتحانات ہوں یا معلمین اور متعلمین کے تعلقات اور داخلی انتظامی امور غرض کہ ہر حیثیت سے ہمارا ماضی نہ صرف حوصلہ افزا ہے بلکہ ایک زیادہ شاندار مستقبل کا پیش خیمہ بھی ہے، اس سال ہم نے دیوالی کی تعطیلات میں ’یوم کلیہ منایا‘ یہ چیز اورنگ آباد کے لئے بالکل نئی تھی، اس جشن کا نظام العمل ہر اعتبار سے اچھا تھا، مقامی عہدہ دار اور معززین کے علاوہ دوسرے اضلاع اور خود دار السلطنت سے بھی اکثر حضرات اس موقع پر

تشریف لائے تھے، اس کی تفصیل ناظرین کو اخبارِ کلیہ کے ذیل میں ملے گی، ہماری دعا ہے کہ ہم اسی طرح ہر سال جشنِ کلیہ منایا کریں، ہم سب کو اپنے کالج کے ساتھ سچی محبت اور اس کے کارناموں پر جائز فخر ہوا اور اس کی روایات جن کی بنا آج کل قالی جا رہی ہے آنے والی نسلوں کے ائمے مشعلِ ہدایت کا کام دیں۔

ایونک ایونک سال نہ شد، آفریں ہر سال نو

قوموں کی ساخت، ان کے مزاج کی تخیل، اور ان کے باہمی تعلقات پر جو اثر اختلافِ زبان کا ہوتا ہے اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں، قومیت کی تعریف میں جہاں اور بہت سے اجزا داخل ہیں وہیں مشترکہ بھاشا بھی اس کا ایک لازمی جز ہے، یورپ ایک صدی سے اس کوشش میں ہے کہ مختلف اقوام کے درمیان رابطہ زبان پیدا کرے، چنانچہ اسپرانتو (Esperanto) رلاپک (Volapuck) ایڈیم نیوٹرل (Idiom Neutral) وغیرہ کئی عارضی زبانیں بنائی گئیں۔ ان میں سے کچھ تو مت گئیں اور کچھ باقی ہیں اور ان کے بولنے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں، ابھی حال میں کلکتہ کی ایک انگریزی خاتون نے بھی اوم ”Om“ نام کی ایک اور جگت بھاشا تجویز کی ہے۔

اسی سلسلہ میں ناظرین کے ائمے یہ معلوم کرنا سبق آموز ہوگا کہ حال ہی میں بالشوویک درس میں جو زبردست اجتماع جرمن اور سربوئی مزدوروں کا ہوا اس میں ایک

کثیر تعداد اسپرانتو بولتی تھی۔ جلسوں اور کارخانوں میں یہی زبان استعمال کی گئی۔ سوویت (Soviet) قلم خانہ کے اعلیٰ حکام نے بین الاقوامی مراسلت کے لئے پوست کرتے بھی اسی زبان میں چھپوائے ہیں، غرض کہ ہر طرح سے اس کی کوشش کی جا رہی ہے کہ یورپ کی اقوام میں ایک متحدہ رابطہ خیالات قائم کیا جائے، کیا ہمارا ہندوستان بھی اس قسم کی کوشش کی کوئی مثال پیش کر سکتا ہے؟ کیا یہاں بھی کسی نے کوئی ”بھارت بھاشا“ تجویز کی؟ کتنی قابل افسوس بات ہے کہ دوسرے براعظم تو اپنے مختلف النسل سپوتوں کو ملا رہے ہیں، وحدت زبان کی قربان گاہ پر ذاتی خصائص اور امتیازات کو بے دریغ قربان کر رہے ہیں اور ہمارے یہاں کے اہل قلم اختلاف عقاید اور ذات پات کے جھگڑوں ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان سے متاثر ہو کر مختلف زبانوں کا اکھڑا تیار کرتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ مختلف زبانوں کے سنگم ہی میں ہمارے ملک کی نجات ہے، ہمارے یہاں کے معاشی اور معاشرتی مسائل کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ ”بھارت بھاشا“ ہے، ابھی کچھ دنوں اور غفلت رہے گی، ذاتی اغراض عام ملکی مفاد پر ابھی کچھ دنوں غالب رہیں گے لیکن بالآخر لوگ اس کی ضرورت کو محسوس کریں گے، اور جب وہ دن آئے گا تو ہمارے جامعہ عثمانیہ ہی کی طرف سب کی نظریں اٹھیں گی۔ بھارت بھاشا اسی مادر علمی کے آغوش میں پل رہی ہے اور یہیں پوراں چڑھے گی،

جو اس ارتقاء کی رفتار کو روکے گا ہندی قومیت کے حق میں بس بولے گا۔

نہ سمجھو گے تو مت جاو گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

گزشتہ چھ ماہ میں افق ہند کے تین درخشاں ستارے
تربے، ابھی ملک چترنجن داس جیسے دلسوز مدبر اور
سچے شاعر کی مراسم تعزیت بھی ادا نہ کرنے پایا تھا کہ
سریندر ناتھ بنرجی جیسے خطیب اور قانون دان کی موت
پر نوحہ خوانی کرنی پڑی، اور اس سے پوری طرح فراغت
نہ ہوئی تھی کہ مہارشی رام کرشن گوپال بھندار کر
وفات نے ایک مرتبہ پھر صف ماتم بچھادی۔ بھندار کر
صاحب ایک مشہور مستشرق تھے، اور اگلے وقتوں کے ان
عالموں کی یادگار تھے جو نام و نمود، شہرت اور عزت سے
بے نیاز ہو کر دلی لگن اور خلوص کے ساتھ علم کی خدمت
کرتے تھے، وہ پرانے زمانے کے رشیوں کی نشانی تھے، انہی کی
سی سادہ اور بلند زندگی، اور انہی کی طرح روحانی رفعت
رکھتے تھے۔ مختلف سماجی مسائل مثلاً عقد بیوگان، تعلیم
نسوان، اچھوت ذاتوں سے پرہیز وغیرہ کے متعلق ان کی
کوششیں مجتہدانہ تھیں۔ علمی حیثیت سے ان کی زبردست
ترین یادگار پونہ کا بھندار کر افسٹی ٹیوت ہے جو انہوں
نے قدیم سنسکرت علوم کے احیاء کے لئے قائم کیا تھا، سنسکرت
ادب اور ہندی تاریخ کے متعلق یہ ادارہ کئی قابل قدر

تصنیفات شایع کرچکا ہے اور آج کل مستند نسخوں سے
 مہا بھارت کا ایک مکمل ادیشن تیار کر رہا ہے، اس نمبر
 میں فاطرین سی۔ ر۔ اس آنجہانی کی ادبی زندگی کے
 متعلق ایک مضمون ملاحظہ فرمائیں گے۔ آئندہ انشائلیہ
 مہارشی بھنڈار کرکی سوانح حیات پر روشنی ڈالی جائے
 گی۔ یہ لوگ علم کے سچے خادم تھے، اگر ان کی زندگیوں پر
 غور کی نظر ڈالو تو ان میں ایسی ایسی باتیں نظر آئیں
 جو ہمارے لئے درس عمل کا کام دیں۔
 زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے!

یہ تو قصص رفتگان تھے، لیکن دنیا ابھی ایسے لوگوں
 کے پاک وجود سے بالکل خالی نہیں ہوئی ہے۔ انہی جانے
 والوں کی طرح طلب علم پر جان دینے والے، دھن کے پکے
 سرسوتی کے سچے پجاری خود ہمارے ملک میں ارر دوسری
 جگہ موجود ہیں۔ چنانچہ اطلاع ملی ہے کہ مشہور امریکی
 ماہر موسیقی جارج اینتھیل (George Antheil) جو چند
 عربی راگنیوں کی تحقیق کے لئے اوائل اگست میں پیرس
 سے افریقہ گئے تھے کہیں صحراے اعظم میں کھو گئے ہیں۔
 یہ ابتداً تونس (Tunis) گئے لیکن جب وہاں بھی تشریف
 نہ ہو سکی تو جنوب کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ اس وقت
 اب تک ان کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی کہ کہاں ہیں
 اور کس حال میں ہیں، صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ کانگو
 (Kongo) کی طرف گئے ہیں۔ امریکی حکام متعینہ پیرس نے

ان کے تلاش کرنے کے لئے جو کاروان بھیجے تھے وہ اس عظیم الشان صحرا کو عبور نہ کر سکے اور واپس آگئے، ان کی سلامتی کے متعلق لوگوں میں بہت کچھ ہراس پیدا ہو گیا ہے۔

ذوق جستجو اور ایثار کی یہ کیسی روشن مثال ہے!

جن لوگوں نے امریکی تہذیب کا مطالعہ ٹھہری نظر سے کیا ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہاں کی تہذیب قائم ہوتے ہی اتنے مختلف اسباب سے متاثر ہوئی کہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ملک ہمیں ہر حیثیت سے مجموعہ عجائبات نظر آتا ہے، اگر ایک طرف خیراتی کاموں کی کثرت ہے، تو دوسری طرف جرائم کی تعداد میں اضافہ ہے۔ اگر ایک طرف ایک حلقہ ایسا ہے جو ہمہ تن تحقیق اور علمی تجسس میں مصروف ہے تو دوسری جانب ایسی ہستیاں بھی کچھ کم نہیں جو اپنا ایک نیا مذہب بنا کر تحقیق علمی کے پیچھے پرگئی ہیں، اور دنیا سے اس بات کی توقع رکھتی ہیں کہ وہ علم اور تجربہ سب کچھ بالائے طاق رکھ دے!

عقیدے اور مذہب کی یہ جنگ آج کل امریکہ میں بہت زور شور کے ساتھ ہو رہی ہے اسے علمی ترقی اور سائنس کی تحقیقات کا رد عمل کہا جاسکتا ہے۔ آج کل وہاں ایک نیا فرقہ پیدا ہوا ہے، یہ لوگ اپنے آپ کو اساسی (Fundamentalist)

کہتے ہیں ان کا خاص مسلک یہ ہے کہ انجیل مقدس کے جو عقاید دلوں سے معور ہوتے جا رہے ہیں از سر نو راسخ کئے جائیں۔ یہ مقصد اپنی جگہ پر کیسا ہی اچھا کیوں نہ ہو لیکن جو طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں وہ ایسے عجیب و غریب ہیں کہ دنیا انگشت بدندان ہے کہ بیسویں صدی میں بھی ایسے خیالات پائے جاتے ہیں !

اخباری دنیا تے فی سی (Tennessee) کے مقدمے کا حال سن چکی ہے۔ یہ امریکہ کی ایک ریاست ہے اور یہاں اس نئے مسلک کے حامی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اس ریاست نے ایک قانون بنایا کہ جو شخص مدارس میں دارون (Darwin) کے مسئلہ ارتقاء کے موافق اظہار خیال کرے گا وہ بحکم مجلس گرفتار کر لیا جائے گا، چنانچہ وہاں کے کالج کے ایک نوجوان پروفیسر جسے -ٹی۔ اسکوپس (G.T.Scopes) اس الزام میں مایخوذ ہو چکے ہیں، اس عجیب و غریب مقدمے نے تھام دنیا میں ہلچل ڈال دی ہے۔ قانونی دفعات یہ ہیں:—

(۱) ریاست تے - فے - سی کی مجلس عام یہ قانون نافذ کرتی ہے کہ ریاست مذکور کی یونیورسٹیوں، نارمل اسکولوں اور تھام سرکاری اور امدادی درسگاہوں میں کسی مدرس یا پروفیسر کا کسی ایسے نظریے کی تعلیم دینا جو انجیل کے قصہ تخلیق آدم کو غلط قرار دیتا ہو، یا یہ دعوے کرتا ہو کہ انسان ادنیٰ حیوانات سے بذریعہ ارتقاء وجود میں آیا ہے، خلاف قانون ریاست ہذا متصور ہو گا۔

(۲) نیز واضح رہے کہ جو مدرس یا پروفیسر اس دفعہ کی خلافت ورزی کرے گا وہ خلافت ورزی قانون کا مرتکب گرداغا جائے گا اور ماحوذ ہونے کے بعد اس پر کم از کم ۱۰۰ قالر (۳۵۰ روپیہ) اور زیادہ سے زیادہ ۵۰۰ قالر (۱۷۵۰ روپیہ) جرمانہ ہر غلطی کی پاداش میں کیا جائے گا۔

(۳) یہ مسرودہ بعد منظوری فوراً قانون کا حکم رکھے گا کیوں کہ مفاد عامہ اسی کا متقاضی ہے۔

غریب ایشیا اپنی ضعیف الاعتقادی کے لئے بد نام ہے، مغربی سائنس داں اور محققین اس پر سدا سے قدامت پسندی کا الزام لگاتے رہے ہیں، مشرقی درباروں کے متعلق اُن کی سرکار سے یہ فتویٰ ناطق ہو چکا ہے کہ یہ آزادی راے کو سلب کرتے ہیں، امریکہ ایک روشن خیال ملک سمجھا جاتا ہے، تہذیب حاضر کی علمبرداری کا سہرہ اسی کے سر ہے، پھر یہ کیا بوالعجبی ہے کہ آج وہیں کی ایک ریاست علمی اکتشافات اور مباحثوں کی زبان بند کرتی ہے اور ریاست ہائے متحدہ کی ۳۸ ریاستوں میں سے ۱۵ کی مہرین تحقیق و تجربہ کے اس قتل نامہ پر ثبت ہوتی ہیں۔

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا، کہتے ہیں
یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں؟

ہماری جامعہ کے قیام کو آٹھ سال ہو چکے ہیں، شہریار دکن خلدالدہ ملکہ کے علم پرور ہاتھوں نے جو بیج بویا تھا

وہ اب خدا کے فضل سے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے اور پھل پھل رہا ہے، جامعہ عثمانیہ کا قیام ہندوستان میں ایک تجربے کا آغاز تھا، اُردو خواہ حضرات اپنی زبان کی بے مایگی سے متروک تھے، ان کے دلوں میں شبہات تھے کہ ہندوستان کی ہوا اس نئے پردے کے حق میں راس بھی آتی ہے یا نہیں، آج اُن کے شبہات رفع ہو گئے ہیں، جہاں تردید تھا، وہاں اب یقین ہے، جو اُردو جامعہ کے نام پر ہنستے تھے اب وہ متعجب ہیں، یہ لوگ اتنا ذہن سمجھتے تھے کہ شاہوں کی سرپرستی اور خادمان علم کا ایثار ناممکن بنا دیتا ہے!!

اس سال پہلی مرتبہ ہماری جامعہ نے تقسیم اسناد فصیلت (Convocation) کے لئے ایک جلسہ منعقد کیا۔ عالی جناب نواب ولی الدولہ بہادر امیر جامعہ (Chancellor) نے اپنا فاضلانہ خطبہ صدارت پڑھا، ہم اس خطبہ کو بجنسہ نقل کر رہے ہیں، جو ناواقف ہیں اُن کو اس خطبہ سے جامعہ عثمانیہ کی اصلی اہمیت کا اندازہ ہوگا، جو اس مادر علمی (Alma mater) کی خدمت کر رہے ہیں یا اُس کی آغوش میں پل رہے ہیں، اُن کے دل میں اس خطبہ کو پڑھ کر فرحت و انبساط کی لہریں دوڑیں گی، ہمیں امید ہے کہ ہماری جامعہ کے طلباء جناب نواب امیر جامعہ کی قیمتی نصیحتوں کو گوش ہوش سے سنیں گے، جو ان انہوں موتیوں کو اپنے ذہن کے خزانہ میں محفوظ رکھے گا، علم کی دولت سے مالا مال ہوگا۔

نواب عہد الملک بہادر کے نام سے کون واقف نہیں ہے، آپ کی علم پروری اور خدمت عام، آپ کی اعلیٰ سیرت، پورے ہندوستان میں آفتاب کی طرح روشن ہے، جامعہ عثمانیہ خصوصیت کے ساتھ آپ کی مساعی جہیلہ کی مہندوں منت ہے، اس سال آپ نے اپنی عمر کا ۸۳ واں سال ختم کیا ہے، اس سے زیادہ کسی مالک کی اور کیا خوش نصیبی ہو سکتی ہے کہ اُس کے سچے فرزند درازی عمر کی نعمت سے بھی مالا مال ہوں۔ جامعہ عثمانیہ نے آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایل-ایل-تی کی سند آپ کی خدمت میں پیش کی ہے، ہم اس دھری مسرت کے مرقع پر اپنے کلیہ کی طرت سے نواب صاحب موصوف کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ہمارے کالج پر آپ کے احسانات بہت زیادہ ہیں، وہ ہمیشہ آپ کی سرپرستی پر فخر کرے گا، ہماری آنے والی نسلیں استحسن اور مہذونیت کے ان جذبات کو لیں گی اور دوسرے آنے والوں تک پہنچائیں گی، رسالہ اُردو نے آپ کی تفصیلی سوانح حیات شایع کی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ابھی آپ برسوں تک اسی طرح صحیح و سلامت رہیں اور اپنے لگے ہوئے فونہالوں کو پروان چڑھتا دیکھیں۔



تاریخ کی تعلیم کا مدعا کیا ہے؟

(مولوی سید ہاشمی صاحب رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی جشن ”یوم کلیہ“ اورنگ آباد میں شریک ہونے کے لئے حیدرآباد سے تشریف لائے تھے۔ مگر خالی ہاتھ نہیں آئے تھے، ہمارے لئے اپنے ساتھ ایک تحفہ بھی لائے تھے۔ یہ مضمون جو انہوں نے جلسہ میں پڑھا، مدتوں کے غور اور فکر کا نتیجہ ہے اور طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لئے نہایت مفید ہے۔ اُمید ہے کہ ہمارے طالب علم اور پروفیسر اسے غور سے مطالعہ کریں گے۔ اڈیٹر)

ایسی تاریخ کا جو ہماری حالتِ حاضرہ پر کوئی اثر نہیں رکھتی، مطالعہ کرنا بیکار ہے۔ گزرے ہوئے واقعات کا ایسا بیان جس کا ہمارے حال و مستقبل سے کوئی صریحی تعلق نہیں، اُس کی مدرسوں میں تعلیم دینے، بچوں کا وقت ضایع کرنا ہے۔ عقل مند ماں بچے کو بزرگوں کے ایسے قصے سناتی ہے جن میں فیاضی اور بہادری، نیکی اور شرافت کے کارنامے مذکور ہوں اور انہیں سن کر از خود بچے کے دل میں اچھے کام کرنے کا شوق اور اچھی خصلتوں کی قدر پیدا ہو جائے۔ مگر نا سمجھہ عورتیں بچوں کو دیو

پوری کے لایعنی افسانے سناتی ہیں۔ یہ کہانیاں بھی اگر دلچسپ اور تعجب انگیز ہوں تو فائدے سے خالی نہیں، لیکن اُن سے صرف تخیل تیز ہوتا ہے، تعقل کی تربیت نہیں ہوتی اور وہ عہلی زندگی میں کچھ کام نہیں آتیں۔ گذشتہ زمانہ کی تاریخ، موجودہ حال سے بے تعلق ہو کے لکھی جائے تو ظاہر ہے کہ وہ ان کہانیوں کے برابر دلچسپ بھی نہ ہوئی اور اُس کے پڑھنے سے عہلی زندگی میں بھی کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

یہ نسل جو اس وقت ملک میں آباد ہے، اس کے تمدن، عادات و رسوم، اخلاق و آراء، اس کی جسمانی صحت اور دماغی حالت، اس کی آرزوئیں اور اس کے مقاصد——ان میں سے بہت سی چیزوں کی ابتدا آج سے سالہا سال بلکہ صدیوں پہلے ہوئی تھی۔ اگر تاریخ لکھنے یا پڑھانے والا اس گھلی ہوئی حقیقت کو پیش نظر نہیں رکھتا تو کہنا چاہئے کہ وہ افسانوں اور پتھروں میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ وہ قزم کی بجائے کسی بے جان پہاڑی کی سرگزشت سنا رہا ہے۔

اگر عربی تاریخوں سے قطع نظر کیجے تو ہمارے مشرقی ملکوں کی جو تاریخیں گزشتہ چھ سات سو برس میں لکھی گئی ہیں وہ اہل قلم نے زیادہ تر سلاطین و امرا کو خوش کرنے کے واسطے لکھی تھیں۔ ان کے واقعات اکثر صدیح اور بعض اجزا بہت دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ بایں ہمہ یہ تاریخیں انہی بادشاہوں کی رزم بزم کے

افسانے سناتی ہیں۔ عام لوگوں سے یا لوگوں کے عام حالات سے اُن میں بہت کم بحث کی جاتی ہے اور ضمناً کی بھی جاتی ہے تو وہ تشنہ اور بعض اوقات غلط فہمی پیدا کرنے والی ہوتی ہے۔ یہی حال مدتوں مہالک یورپ کی تاریخ کا رہا۔ بلکہ دور جدید یعنی اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بھی وہاں جو تاریخیں تالیف ہوئیں ان میں بادشاہوں کے نہیں، تو صرف حکومتوں کے وقائع اور سیاسی حالات تحریر ہیں اور یہ بات اب تک ضرب الہٹل کے طور پر کہی جاتی ہے کہ گزشتہ عہد کے سیاسی واقعات ہمارے زمانہ کی تاریخ ہیں۔

تاریخ کے اس طرح خالص سیاسی مضمون بن جانے کا بڑا سبب یہ ہے کہ پچھلی تین صدی کے اندر یورپ میں عظیم الشان سیاسی انقلابات پیدا ہوئے ہیں۔ یہی زمانہ ہے جس میں وہاں حسب نسب کے بے جا حقوق و امتیازات مٹائے گئے۔ استبدادی اور شخصی حکومت کا زور ٹوٹا اور طویل کشاکش اور سخت کشت و خون کے بعد عام لوگوں کو ملکی معاملات میں حصہ لینے کا حق ملا اور نیا بقی یا دستوری حکومت قائم ہوئی۔ اہل یورپ کو بجا طور پر اپنے اسلاف کی اس کامیابی کا فخر ہے اور ان کا ہر مصنف اس سیاسی انقلاب کی جزئیات تک کو بڑے ذوق شوق کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہالک یورپ میں فن تاریخ کی اکثر مشہور و مقبول تصانیف سیاسی اور آئینی بحثوں سے لبریز نظر آتی ہیں۔

لیکن ہم اگر اپنے ملک کی تاریخ میں صرف سیاسی یا حکومتوں کے حالات تحریر کریں گے تو وہ فقط بادشاہوں کی حرص و ہوس، غصب و تغلب اور جنگ و جدال کی ایک بے اطف روئے داد بن جائے گی۔ بے شبہ ہمارے ہاں جب کسی فرماں روا کی ظلم و تعدی حد سے بڑھی تو گویا قدرت کی طرف سے اس کی سرکوبی کے سامان پیدا ہو گئے اور کسی باغی امیر یا سلطنت کے مدعی نے اسے نکال باہر کیا۔ لیکن حقوق عوام اور ان کی جد و جہد کا ہماری تاریخ میں کوئی عنوان نہیں ہے۔ پس ہم تاریخ کو صرف سیاسی واقعات تک محدود رکھیں گے تو اس کی تعلیم بالکل غیر دلچسپ اور غیر مفید ہو کر رہ جائے گی۔ اگر ہمیں اپنے طلبہ کو فقط یہ سبق دینا منظور ہے کہ تغلق و اکبر نے کون کون سے ممالک چھینے، شاہجہاں نے کن حریفوں کو زیر کیا، اور مرہٹوں نے کہاں کہاں غارت گری کی اور حیدر علی نے کس طرح سلطنت پر غاصبانہ قبضہ جمایا، تو کچھ ہرج نہیں ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کو مدرسوں کے نصاب سے خارج کر دیا جائے اور اس کی بجائے ہمارے طالب علم لوگوں کے سیاسی حقوق اور آئینی حکومت حاصل کرنے کی داستانِ یورپ کی تاریخوں میں مطالعہ کریں۔ لیکن گو قزم کی خوش حالی اور نشوونما اور مادی اور اخلاقی حالت کا بہت کچھ مدارِ اہل حکومت اور طرزِ حکمرانی پر ہے اور اس کے احوال اور رد و بدل کا تذکرہ ناگزیر ہے، تاہم تاریخ کو سیاسیات و ملوکیات میں مقید کر دینا

کوئی لازمی بات اور فرض نہیں ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کی تدوین اور تعلیم میں وسعت نظر سے کام لیا جائے تو تاریخ ترقی تمدن کی رہنما اور اخلاق کی بہتری مصالح بن سکتی ہے اور قوموں کو آسودگی اور خوش دلی سے زندگی بسر کرنے کا ایسا دل نشین سبق سکھا سکتی ہے جو اور کسی علم یا فن کی تعلیم سے ممکن نہیں۔

یہ بات اب تاریخ کا ہر استاد جانتا ہے کہ قوموں کی زندگی پر بڑا اثر قدرتی اسباب ہوتا ہے۔ کسی ملک کے تمدن و معاشرت اور خود طرز حکومت اور اساسی حالات، وہاں کے جغرافیے سے وابستہ ہیں۔ یعنی ملک کی آب و ہوا، دریا پھاروں اور میدانوں کی نوعیت، اس کا ساحلی یا بری ہونا وغیرہ وغیرہ قدرتی اسباب رہاں کے باشندوں کو تمدن کے خاص خاص راستوں پر لے چلتے ہیں۔ مگر جس فکتنے پر اہل تاریخ نے ابھی تک ظاہر کافی توجہ نہیں فرمائی یہ ہے کہ جس طرح قوموں پر فطرت کے خارجی قوانین کا اثر ہے اسی طرح انسانی تمدن اور قومی ثروت و آسودگی کے بھی قدرتی قوانین ہیں اور ان کا عمل بھی ایسا ہی یقینی اور ناگزیر ہوتا ہے جیسا کہ گرمی سردی یا باد و باران کے طبیعی عوامل کا۔ قومی دولت کی کمی بیشی کے متعلق اس زمانے میں عام کی ایک مستقل شاخ اقتصادیات یا معاشیات کے نام سے مدون ہو گئی ہے لیکن ابھی تک تاریخوں میں اقتصادی مسائل پر کافی زور نہیں دیا جاتا۔ حالانکہ کسی قوم کا موجودہ افلاس، صریحاً

اس کی گزشتہ اقتصادی حالت کا نتیجہ ہے۔ رہے تہدنی قوانین، تو بے شبہ یہ قوانین، اقتصادی اور طبیعی قوانین کی نسبت کہیں زیادہ پیچیدہ اور دیر اثر ہوتے ہیں اور عقل انسانی ان کا صحیح تعین کرنے سے عاجز نظر آتی ہے۔ بائیں ہمدان کے وجود اور عمل سے کسی صاحب خرد کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر جس قوم میں راست بازی اور معاملے کی سچائی نہیں ہے اس کی تجارت اور آسودہ حالی میں زوال آنا یقینی ہے۔ یا جس قوم کے اسلاف نے عیش و تن آسانی میں زندگی گزاری ہے، پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ اس کی اولاد و اخلاقیات سے رفتہ رفتہ محنت و جفاکشی کی صلاحیت مفقود ہو جائے گی۔ میں نے یہاں تفصیل میں پڑنے سے عہداً پہلو تہی کی ہے ورنہ تہدن کے ان قوانین کے اندر معاشرت اور باہمی معاملت یعنی وراثت، ازدواج، لین دین، غرض اجتماعی زندگی کی جملہ ضروریات داخل ہیں۔ تہدن کے ان قدرتی اور اخلاقی قوانین کی صحیح حدود بتانا تاریخ کا کام نہیں ہے مگر تحقیق و احتیاط کے ساتھ قوموں کی سرگزشت میں ان قوانین کے عمل اور اثر کا سراغ لگانا، اپنا وطن کی سب سے بڑی خدمت ہے جو تاریخ کے معلم کو انجام دینی چاہئے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی تاریخ محض ہماری نام نہاد تاریخی ماخذوں سے مرتب نہیں ہو سکتی۔ ایسی تاریخ کے لئے استاد یا مورخ کو خواہ مخواہ متعلقہ عہد کی ہر قسم

کی تصنیفات اور آثار اور چھوٹی بڑی ہر طرح کی یادگاروں سے جس قدر ممکن ہو وسیع واقفیت بہم پہنچانی پڑے گی تاکہ وہ پہلے اپنے ذہن میں اور پھر طلباء کے تصور میں اس زمانے کے لوگوں کی، ان کی معاشرت اُن کے خیالات اُن کے اخلاق کی اور اُن کی غلط روی اور نقصانات کی واضح تصویر کھینچ دے۔ اور اُس تہام کوشش کی کامیابی جیسا کہ میں نے مضمون کے آغاز میں اشارہ کیا اس بات پر منحصر ہوگی کہ طالب علم جس عہد کی تاریخ پڑھ رہا ہے اس عہد کے خود اپنی زندگی کا ایک گزرا ہوا زمانہ سمجھنے لگے۔ پھر، جس طرح جوانی کے تجربے یا نا تجربہ کاری اور نادانی سن کہوات میں غلطیوں کے نقصان اور صدمے یاد دلا کر ہمیں دانائی سکھاتی ہے اسی طرح موجودہ نسل اپنے اسلاف کی لغزشوں اور کوتاہیوں کے اثرات کا خود اپنے احوال میں معاینہ کرے گی اور اس کی تلافی پر آمادہ ہوگی اور کوشش کرے گی کہ قوم کی آئندہ زندگی کے لئے ایک بہتر و خوبتر تہدیں کا راستہ تیار کر جائے۔

مختصر طور پر، خاکسار کے نزدیک تاریخ کے پڑھنے کی غرض یہ ہے اور اسی مدعا کو پیش نظر رکھ کر تاریخ کی تعلیم ہونی چاہئے۔



خطبہ

عالیجناب نواب ولی الدولہ بہادر امیر جامعہ

بتقریب جلسہ تقسیم اسناد فضیلت

سنہ ۱۳۳۲ ہجری - سنہ ۱۳۳۲ ف - سنہ ۱۹۲۵ ع

رفقائے جامعہ و معززین

آج کی تقریب مسرت میں بحیثیت امیر جامعہ آپ صاحبان کا خیر مقدم میرے لئے موجب ناز و انبساط ہے۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ آج کا دن تاریخی اور یادگار دن ہے۔ یہ محض تقسیم اسناد ہی کی تقریب نہیں ہے بلکہ یہ اُس مبارک سعی کی بارآوری کا یوم سعید ہے، جس کی طرف ہم سب کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں اور جس کی بنا آٹھ سال پہلے ہمارے آقائے نامدار اور علم و ہنر کے مربی اعلیٰ حضرت شہریار دکن خلد اللہ ملکہ، و سلطنتہ نے رکھی تھی، اور اپنی فراست و دور اندیشی اور روشن خیالی اور بلند حوصلگی کا ایسا کرشمہ اہل بصیرت کو دکھایا تھا جس کی نظیریں تاریخ کے اوراق میں بہت کم ملتی ہیں۔

اس جامعہ کی تاسیس مہالک ہند کی تاریخ تعلیم

میں ایک بالکل جدید اور پر اُمید باب کا اضافہ ہے۔
 گزشتہ نصف صدی سے تھام ہندوستان میں ہر قسم کے
 علم و فن کی اعلیٰ تعلیم کا جو اُصول نافذ اور مسلم ہے
 اس کے خلاف ایک سخت ایک نئے اُصول کا اختیار کرنا، یعنی
 انگریزی زبان کی بجائے ایک دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم
 بنانا بڑی جرأت و ہمت کا کام تھا۔ انٹر اہل الرائے اور
 ماہران تعلیم اس جدت و اجتہاد پر متردد تھے اور انہیں
 اس تجربے کی کامیابی کے متعلق بہت کچھ شبہ تھا۔ جن
 صاحبزوں نے اعلیٰ تعلیم اور طریق تعلیم کی داستان پڑھی
 ہے اُن سے یہ نکتہ مخفی نہ ہو گا کہ دنیا کے ہر ملک میں
 جہاں تہذیب و تمدن کا قدم آیا وہاں افسانہ علم کے خاص
 معارف و اسرار سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے کسی نہ کسی
 غیر زبان کا رہین منت ہرنا پڑا۔ از منڈ وسطیٰ میں یورپ
 کی درسی زبان لاطینی تھی اور نہ صرف لاطینی بلکہ
 ”پے دوا“، ”بولونا“ اور ”پیرس“ و ”رما“ کے شہرہ آفاق
 علمی جامعات میں خود ہماری مقدس زبان عربی کا تسلط
 تھا۔ انگلستان میں جب اعلیٰ تعلیم کا دور آیا تو وہاں
 بھی یہی ہوا اور بڑے بڑے علمی مرکزوں میں لاطینی
 ایسی ہی لازمی تھی جیسے ہمارے ملک میں اس وقت
 انگریزی زبان ہے۔ اس لئے کہ لاطینی کی واقفیت کے بغیر
 علم و فن کے کسی شعبہ میں قدم بڑھانا غیر ممکن تھا۔

لیکن حضرات! غیر زبانوں کے ذریعہ سے عام کی تحصیل
 کیسی ہی مفید اور فائزیر کیوں نہ مانی جائے، یہ سلسلہ

غیر محدود زمانہ تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اقوام کی زندگی میں ایک ایسا وقت آتا ہے جب کہ علم کا شوق اور تشنگی اُن کو بیتاب کر دیتی ہے اور یہ جوش اس قدر عام اور موج زن ہو جاتا ہے کہ نہ اُس سے اغماض ہو سکتا ہے اور نہ غیر زبان کی محدود وساطت اسے سیراب کر سکتی ہے۔ یہی اسباب تھے کہ یورپ کے ملکوں میں لاطینی کے بجائے مائکلی السنہ کو اختیار کرنا ضروری ہوا۔ گویا وہ دیواریں جنہوں نے حصول تعلیم کے راستے کو تنگ گھاٹی بنا رکھا تھا، توڑ کے فراخ و کشادہ شارع عام تیار کی گئی اور اس کے ساتھ ہی علوم و فنون کے قصر پر یورش ہوئی اور اس پر اسرار لاطینی حصار کے دروازے کھل گئے۔ اُس میں مطلق شبہ نہیں کہ ملکی زبان میں اعلیٰ تعلیم دینا بجائے خود ملکی فلاح و ترقی کی دلیل اور اہل ملک کی روشن خیالی اور ہمت کا ثبوت ہے۔ اطالیہ، فرانس، انگلستان سب جگہ یہی عمل ہوا اور باہر کی علمی زبان کی جگہ قوم کی مروجہ زبان ذریعہ تعلیم قرار پائی۔ قریب زمانہ میں اسی قسم کا انقلاب ملک جاپان میں واقع ہوا۔ یہ دیکھ کر کہ خود ہمارے عزیز وطن میں دہسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے متعلق جو شبہات اور اندیشے تھے وہ کلیتاً زائل اور نابود ہو گئے، مجھے الفاظ نہیں ملتے کہ اپنے دای فخر و مسرت کا اظہار کروں۔

حضرات! ہمارا تجربہ کامیاب ہوا۔ ہمارے روشن ضمیر فرمانروا (خلدالہ ملکہ ر ساطنتہ) نے انتہائی لطف

و روم اور کمال رعایا پروری سے جس حقیر تخم کی آبیاری فرمائی تھی وہ آج ایک تناور درخت کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ یہی نہیں کہ ہمارے تجربہ کے سرسبز و کامیاب ہونے میں کسی کو شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی، بلکہ میں ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی اسی آواز کی گونج سنتا ہوں جو چند سال پہلے بلند فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں بلند ہوئی اور محض ”صدا بصعرا“ سمجھی جاتی تھی۔ اب وہ رفتہ رفتہ اس اصول کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور کچھ عجب نہیں کہ آئندہ چند سال میں ہم برطانوی ہند کی اعلیٰ درسگاہوں کو جامعہ عثمانیہ کے نقش قدم پر گام فرسائی کرتا ہوا پائیں۔

یہ امر بلاشبہ موجب مسرت ہے کہ جامعہ کی عام تعلیم اور اُس کے مختلف شعبوں کی حالت نہایت قابل اطمینان ہے۔ لیکن جامعہ عثمانیہ کو حقیقی جامعہ بنانے کے لئے ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ ہمیں فارغ التحصیل طلبہ کے واسطے بہتر سے بہتر ماحرازہ اور محققانہ تعلیم و رہنمائی کا انتظام اعلیٰ پیمانہ پر کرنا ہوگا اور مجتہدانہ تحقیقات اور اکتشافات کے لئے جدید سے جدید سامان مہیا کرنا ہونگے۔ اگرچہ ان چیزوں کا کچھ کچھ آغاز ہو چکا ہے اور دوسرے علوم کے ساتھ طب اور انجینیری جیسے فنون کی تعلیم کا بھی انتظام ہو رہا ہے اور ان کی توسیع کی فکر کی جا رہی ہے، تاہم ہماری جامعہ عثمانیہ بالکل

ابتدائی اور گویا طفولیت کی حالت میں ہے۔ جب تک ہم اعلیٰ تعلیم و تحقیقات کا سرانجام کرنا اپنا مطمح نظر نہ بنائیں گے اس وقت تک عامی دنیا ہماری سعی کی کچھ بہت قدر و منزلت کرنے پر آمادہ نہ ہو گی۔ علوم میں بھی جن شعبوں کی محققانہ تعلیم کی طرف توجہ کرنا جامعہ عثمانیہ کا سب سے مقدم فرض ہے، وہ ہمارے قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم طبیعی ہیں، جو ہماری دماغی اصلاح کے ساتھ ہماری معاشرت کی بھی اصلاح کریں گے، جو ہمارے ملک میں دولت و ثروت کا دریا بہا دیں گے اور ہماری سر زمین کو لہلہاتی کھیتیوں اور ہمارے بازاروں کو حرفت و دستکاری کی صناعیوں سے سالا مال کر دیں گے۔ ان علوم کے سمجھنے اور سمجھانے سے نہ صرف ہماری قوم بلکہ درحقیقت نوع انسان کا ذہنی اور خارجی ارتقا وابستہ ہے۔ اس لئے ہم سب کا فرض ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی عظمت و شان بڑھانے میں تا مقدور کوشش کریں۔ اب تک اشاعت علوم کے لئے یہاں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے وہ سب اعلیٰ حضرت و اقدس خسرو دکن (خلدالہ ملکہ و سلطنتہ) کے دست کرم کا مرہون احسان ہے اور یہی سبب تھا کہ جامعہ عثمانیہ کی جانب سے سب سے پہلا اور سب سے اعلیٰ خطاب فضیلت، اعنی ”سلطان العلوم“ کمال شکرگزاری اور انتہائی عقیدت و ارادت کے ساتھ اپنے سرپرست و مربی کے حضور میں پیش کیا گیا۔

حضرات! یہ ایک مشہور قول چلا آرہا ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، اور دونوں کا ملنا محال ہے۔ لیکن اب حالت عام دگر گز ہے، واقعات نے ایک دوسرا پلٹا کھایا ہے، نئے انقلاب زندگی کے ہر شعبے میں پیدا ہو رہے ہیں اور ہمیں اپنے مسلمات اور اصول میں جدید تبدیلیاں کرنی پڑی ہیں اور اب اس قول کی صحت میں بھی قوی شبہ پیدا ہو گیا ہے۔ اہل مشرق خوب جان گئے ہیں کہ ہمیں کن چیزوں میں اہل مغرب کی احتیاج ہے اور اہل مغرب بھی اب سمجھنے لگے ہیں کہ ہمیں مشرق سے کیا سیکھنا چاہئے۔ آپس کی کھی پورا کرنے کے لئے ان دونوں کا ملنا لازم ہے اور ان دونوں کے اتحاد میں دنیا کا امن اور نجات ہے۔ کیا تعجب ہے کہ مشرق و مغرب کا یہ سنگم موسیٰ ندی کے کنارے اسی جامعہ عثمانیہ میں ہو جس نے مشرق و مغرب کے علوم و معلومات اور تہذیب و تمدن کو ایک جامع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور جس کی تکمیل میں سب سے زیادہ حصہ یہاں کے فاضل اساتذہ اور ہونہار طلبہ کا ہو گا۔

حضرات! میں آپ کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا۔ ہمارے جلسہ کا خاص مقصد اسناد فضیلت کی تقسیم ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے جو نام میں لیتا ہوں، وہ جامع علوم مشرقی و مغربی نواب عہاد الہاک بہادر کا اسم گرامی ہے، جنہیں میں قلبی مسرت کے ساتھ جامعہ عثمانیہ کی طرف سے ”ایل-ایل-تہی“ کے خطاب کی اعزازی سند

دیتا ہوں۔ اس نامور فاضل اور دیرینہ سال مہر تعلیم سے آپ کا تعارت کرانا تحصیل حاصل ہے کہ اس بزرگ کے اوصاف اور کارناموں سے ملک کا ہر باخبر شخص آگاہ ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس ریاست میں تعلیم جدید کی ساخت و پرداخت بہت کچھ صاحب موصوفت ہی کے ہاتھوں ہوئی جو تیس برس تک ناظم تعلیمات سرکار عالی کے فرایض ادا کرتے رہے۔ آج جب کہ ہم اپنے ملک میں جدید تعلیم کے فروغ و ارتقا کا مشاہدہ اس جلسہ تقسیم اسناد میں کر رہے ہیں، عین مناسب ہے کہ مذکورہ بالا تگری کے پیرایہ میں ہم نواب عہد الملک کی تراسویں سال گروہ منائیں۔

اب اے فارغ التحصیل نوجوان طالب علمو! میں تمہیں علمی سند کے حاصل کرنے پر مبارک باد دیتا ہوں کہ یہ سند تمہاری طویل محنت اور عرق ریزی اور ذہانت و ہوشمندی کا انعام ہے۔

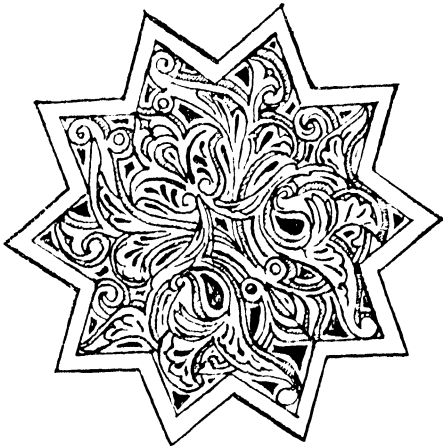
برطانوی عساکر میں زمانہ قدیم سے یہ رسم عزیز جاری ہے کہ اُس فوجی جمعیت کا نشان سب سے کم عمر افسر کے تفویض کیا جاتا ہے جس میں وہ داخل ہوا ہے۔ تاکہ وہ اس کی عزت کو نگاہ رکھے اور اپنی شجاعت و مردانگی سے اعلیٰ مدارج پر پہنچے۔ تم بھی ایک علمی جمعیت کے سب سے کم عمر سپاہی ہو۔ اس کی عزت تمہارے ہاتھ میں دی جاتی ہے۔ جس طرح اس فوجی نوجوان کی شجاعت و مردانگی پوری جمعیت کے لئے باعث فخر و نام آوری

ہوتی ہے، خدا کرے کہ علم و فن کی دنیا میں تمہاری سرگرمیاں بھی تمہاری جامعہ کا نام روشن اور تاب ناک کر دیں۔

مگر یاد رکھنا کہ اپنی زندگی علم کی خالص طالب میں وقف کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ جس قدر تم زیادہ غور اور مطالعہ کرو گے اسی قدر تمہیں یہ معلوم ہوگا کہ نفیس ترین جواہر افکار اسی طرح وجود میں آتے ہیں جس طرح فطرت بے شمار عناصر صرف کر کے ایک پارۂ الہاس تیار کرتی ہے۔ وہ نئے خیالات جو تم دنیا کے نامور حکما اور فضلا کی تحقیقاتوں کے مطالعہ کے بعد اپنی جان کاھی اور تحقیق سے پیدا کرو گے وہ تمہاری مادر علمی یعنی جامعۂ عثمانیہ کے تاج فضیلت کے سچے موتی ہوں گے۔ اہل علم کے وارث اُن کی اولاد نہیں بلکہ رشید شاگرد ہوتے ہیں۔ اس لئے تم بھی سعادت مند طالب علموں کی طرح کامل جد و جہد اور سعی سے علمی سرمایہ جمع کرو اور جاتے وقت یہ وارث اُن جانشینوں کے لئے چھوڑتے جاؤ جو تمہارے بعد جامعۂ میں آئیں گے تاکہ تمہارے کام سے انہیں فخر اور تمہارے نام سے انہیں مسرت ہو۔ تم میں سے ہر شخص جامعۂ عثمانیہ کا سفیر ہے اور تمہارا فرض ہے کہ اس پیام کو ملک کے ہر حصے میں پہنچاؤ اور نور علم سے تاریک ترین کونوں میں اُجالا کر دو۔ جامعہ کی عزت تمہارے ہاتھ ہے۔ لوگ تمہیں دیکھ کر جامعہ کے حسن و قبح کا اندازہ کریں گے۔ اس لئے تم عالی ظرفی، رواداری

خوش اطواری اور ملک کی محبت ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ یہی تمہارا اصل امتحان اور یہی تمہارے عالم و اخلاق کی کسوٹی ہے۔ اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ ابنائے وطن افسوس ناک جہل اور اوہام میں گرفتار ہیں اور جہالت، افلاس اور تہام بد اخلاقیوں کے جز ہے۔ اب اس تربیت گاہ سے جس نے تمہیں مادرِ مشفقہ کی طرح پالا ہے، یہ مشعل ہدایت لے کر جاؤ اور جب تک زندہ رہو ملک سے جہالت اور اوہام کی ظلمت کو زائل کرنے میں سعی کرتے رہو کہ اس سے بڑھکر ملک کے حق میں کوئی کار خیر نہیں ہو سکتا۔
حاضرین:—

اب آپ میرے ساتھ دست بدعا ہوں کہ خداوند عالم ہمارے آقائے نامدار کا سایۂ عاطفت ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔



بھٹکی ہوئی نیکی

از

(جناب مولوی شبیر حسن صاحب جوش ملیح آبادی
دکن دارالترجمہ حیدرآباد دکن)

(حضرت جوش نے ”یوم کلیہ“ میں شرکت کے
لئے خاص طور پر زحمت فرمائی تھی اور حیدرآباد
سے اپنے ساتھ کالج کے لئے ایک ہرا بھرا گلدستہ
بھی لائے تھے۔ یہ فلسفیانہ اور پاکیزہ نظم انہوں
نے بھرے جلسہ میں پڑھی اور حاضرین نے اُن پر
داد و تحسین کے پھول برسائے۔ نظم کا مضمون
اور طرز بیان دونوں بے نظیر ہیں۔ یہ اُن نظموں
میں سے ہے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو
شاعری میں ایک نیا رنگ پیدا ہو رہا ہے۔ ادیترا)

ہر شے کو مسلسل جنبش ہے، راحت کا جہاں میں نام نہیں
اس عالم سعی و کاوش میں دم بھر بھی ہمیں آرام نہیں
چھائی ہے فضا پر تشنہ لبی، مفقود یہاں سیرابی ہے
ہر جسم میں اک بے چینی ہے، ہر روح میں اک بے قابی ہے
اس بزمِ عمل کا ہر ذرہ بے چینیاں کے انبوہ میں ہے
اک رعشہ پیہم کاہ میں ہے، اک لرزش پنہاں کوہ میں ہے

ہستی کی سماعت مضطر ہے، عشرت کے ترانے سن نے کو
 ہر نقص کا دامن پھیلا ہے، تکمیل کی کلیاں چن نے کو
 طوفان ہے قلب پستی میں کیا بام فلک پر چڑھنے کا
 اک رو ہے ترقی کرنے کی، اک جوش ہے آگے بڑھنے کا
اُھر مزم کو دھن ہے شمع بنے، مضطر ہے پگھل جانے کے لئے
اُھر سنگ کا سینہ جلتا ہے پارس میں بدل جانے کے لئے
 انگاروں پہ شعلے لوتتے ہیں، بجلی پہ تفوق پانے کو
 چنگاریاں مرغ بسمل ہیں، تاروں کی جگہ کھل جانے کو
 بے چین بگولا رقصاں ہے آندھی پہ شرت پانے کے لئے
 جو موج ہے پیچ و تاب میں ہے، دھارے سے اُلجھ جانے کے لئے
 ہر قطرہ دریا غلطاں ہے موتی پہ تساط پانے کو
 ہر ذرہ خاکی اُرتا ہے خورشید سے تکر کھانے کو
 ہر دل میں خلش ہے پھولوں سے اُمید کا دامن بھرنے کی
 ہر شے کی تڑپتی فطرت میں خواہش ہے، ترقی کرنے کی

————— : 0 : —————

(۲)

فطرت کی ندا ہے یہ خواہش، ہمت جو دلوں میں بھرتی ہے
انساں کو بلندی کی جانب ہر وقت پکارا کرتی ہے
 ہر قلب میں یوں ہی یہ جذبہ رفعت کی تمنا بھرتا ہے
 جس طرح زمیں کا زور کشش اجسام کو کھینچا کرتا ہے
 خواہش ہی تقاضا کرتی ہے، ہستی کی مہم سر کرنے کا
 خواہش ہی اشارہ کرتی ہے دنیا کو مسخر کرنے کا

————— : 0 : —————

ہر چند یہ ”خواہش“ نادر ہے، لیکن یہ عجب نظارہ ہے
یہ حور بہشتی دنیا میں بے عقل سلیم آوارہ ہے
گو عقل کا استدلال غلط، تدبیر کو اُلجھا دیتا ہے
ہر حال میں لیکن ”خواہش“ اک شفات درخشاں دریا ہے
اُس وقت بھی جب عصیاں کی بدولت دل میں کثافت رھتی ہے
انساں کے سینے میں ”خواہش“ لبریز لطافت رھتی ہے

—————: 0 :—————

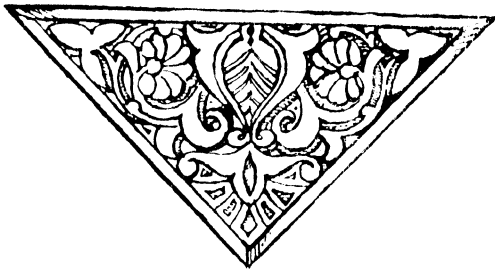
وہ چور، جو شب کے پردے میں سرقے کی غرض سے آتا ہے
جی کھول کے جو بے رحمی سے اسباب اُٹھا لے جاتا ہے
ایک ایسی ہی خواہش اُس کو بھی چوری کے لئے اُکساتی ہے
جس طرح کی ”خواہش“ نورانی دیوتاؤں میں پائی جاتی ہے
سارق بھی فرشتوں ہی کی طرح تسکین دلی کا جو یا ہے
سارق نے مگر نادانی میں تسکین کا رستہ کھویا ہے
رہبر ہو کہ رھزن، دونوں میں تسکین کی خواہش یکساں ہے
قسمت سے وہ سیدھی راہ پہ ہے، یہ راہ بھٹک کر حیراں ہے
عارف نے یہ سمجھا یکسوئی اشکوں کو گرا کر ملتی ہے
قاتل نے یہ سمجھا انساں کا وہ خون بہا کر ملتی ہے
صوفی نے یہ سمجھا وہ دل کے پیہانے میں مل جائے گی
میکش کی سمجھ میں یہ آیا میخانے میں مل جائے گی

پس ذوق طرب میں جو انسان رہتا ہے سدا میخافوں میں
 ہے اصل میں وہ بھی دنیا کے معصوم ترین انسانوں میں

—————: 0 :—————

(۵)

جال اُس پہ نہ تال اے صید فگن! وہ بام حرم کا طائر ہے
 آیا ہے بھٹک کر دیر میں جو گمراہ نہیں ہے، زایر ہے
 جتنے بھی زمیں پر مجرم ہیں ”خواہش“ ہی کے زیر فرماں ہیں
 ہر جرم سیہ کے محضر پر ”خواہش“ ہی کی مہریں تاباں ہیں
 المختصر ان تشریعوں سے ہم پر یہ حقیقت گھلتی ہے
 کہتے ہیں جسے دنیا میں ”بدی“ بھٹکی ہوئی وہ اک نیکی ہے



من کی موج

(مسند اور دریا کی موجوں کے اتار چڑھاؤ کو تو انسان کی عقل ”قانون“ اور ”نظام“ کی تحدت میں لے آئی ہے لیکن ”من کی موج“ کے لئے اب تک قاعدے قانون نہیں بڈائے گئے، اس کے مد و جزر کی زد میں آکر انسان ایک دوسری ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ عقل اور ذہن کے پتلے اس دنیا کی نیورنگ نمایاؤں کو ”خیال کا کرشمہ“ کہہ کر تال دیتے ہیں، لیکن عملی حیثیت سے اس کی اہمیت ”اظہار خیال“ کے اور سب طریقوں سے کہیں زیادہ ہے۔ تہ کی باتوں کو اوپر لانے والی اور افسان کے چھپے ہوئے خیالات اور گمنوں کو ظاہر کرنے والی یہی چیز ہے، ہمیں امید ہے کہ ”نورس“ کے ناظرین ”من-موجی“ کی باتوں کو گوش ہوش سے سنیں گے۔ ”من-موجی“ کا پردہ غالباً اس وجہ سے ہے کہ عقل و ہوش کی ذمہ داریوں سے نجات ملے، سرسری طور پر پڑھو تو اسے دلچسپ پاؤ گے، دل لگا کر سنو تو یہی باتیں سبق آموز ہوں گی، خیالات کو شہ دیں گی، ہمیں امید ہے کہ ہمارے من-موجی دوست اس قسم کی ”تھکانے کی باتیں“ آئندہ بھی سنائیں گے۔ (ادیٹر)

کل میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا ”دیکھو یہ پھول
 کتنا خوبصورت ہے“ میں نے سنا اور نفرت سے منہ پھیر
 لیا، پھر تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے ایک آدمی دکھایا
 اور کہا یہ بڑا نیک ہے، میں پھر ادھر سے پات گیا، لوگ
 خوبصورت، نیک، اچھا اور اسی قسم کے لفظ بولتے ہیں
 اور خوش ہوتے ہیں، میں انہیں سنتا ہوں تو رنجیدہ
 ہوتا ہوں، جیسے ہی میرے کانوں میں ”خوبصورت“
 کی آواز آتی ہے، ویسے ہی اندر والا کہتا ہے کہ پھر بد
 صورت بھی ہوگا، جیسے ہی میں ”نیک“ سنتا ہوں اندر
 والا کہتا ہے کہ پھر تو بد بھی ضرور کہیں ہوگا، اگر میں
 پرندہ ہوتا تو نیک، بد، حسین، کریہہ غرض کہ سب اسہائے
 صفت کی سطح سے اوپر اُتر جاتا

—:0:—

میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا ”پاک اور عقل مند بنو
 تو دنیا کو دس گنا زیادہ فائدہ پہونچے“ میں نے کہا ”تو
 پاکی کو دور کر دے اور عقل مندی کو ہٹا دے
 تو سو گنا زیادہ فائدہ پہونچے“ وہی اسہائے صفات!
 کل میں ایک دوکان پر گیا، وہاں دیکھا کہ ہر چیز پر
 رنگ برنگ کی چٹھیاں لگی ہیں جن پر قیمتیں درج ہیں،
 کیا انسانوں پر بھی چٹھیاں لگانے کی ضرورت ہے۔ پھر اسہائے
 صفات کیوں؟ اچھا کیوں، برا کیوں، نیکی کیوں، بدی
 کیوں، ایمانداری، بے ایمانی، فیاضی، کدجوسی، یہ سب
 کس لئے؟

میں نے ایک فقیر سے کہا ” لوگ فیاض نہ ہوتے تو اچھا تھا “ اس نے مجھے بہت برا بھلا کہا ، پھر میں نے ایک امیر سے کہا ، ” لوگ فیاضی کی تعریف نہ کرتے تو اچھا تھا “ اس نے مجھے اپنے مکان سے نکلوا دیا ، وہی اسماء صفت !

نیکی پہلے کی گئی ، پھر نیکی کھلائی ، بہادری پہلے دکھائی گئی ، پر صفت بنی ، فیاضی ، ہمدردی ، احسان ، ظلم ، کنبجوسی ، پہلے پیدا ہوئے ، پھر ان کو نام دے گئے ، دریا سیدھا بہتا ہو ، دیواریں کھڑی کر دو تو بہاو بدل جائے گا ، اسی طرح دیواریں کھڑی کرتے جاو تو دریا پانی کی بھول بھلیاں ہو جائے گا ، وہی نام کا پھیر ! صفت بندی ، درجہ بندی ، اسم بندی سب دراصل دیوار بندیاں ، ہیں ۔ سیدھے راستے سے بہت کم لوگ بھٹکتے ہیں ، کسی کو نیک مت کہو ، کوئی برا نہ ہوگا ، کسی کو سخی مت کہو ، کوئی کنبجوس نہ ہوگا ، نفع کی خواہش چھوڑ دو ، مکانوں سے پھر اٹھا لو تو چور ، داکو غائب ہو جائیں گے ، بہادری متا دو ، بزدلی بھی مت جائے گی ، حکم ، اٹھا لو ، عدول حکمی نہ ہوگی ، اچھی صفتیں اٹھا لو بری صفتیں آپ جاتی رہیں گی ، دنیا ان دیواروں کو کیوں پسند کرتی ہے ؟

من کی روشنی ! یہ بری چیز ہے ، من اندھیری رات بھی ہو تو من کی روشنی میں سیدھا اپنے گھر چلا جاتا ہوں ۔ میرے دوست کے گھوڑے کا بھی یہی حال ہے ، کل میں نے گلی میں رنگ برنگ کی قندیلیں روشن کیں ، فوراً پرچھائیں پیدا ہو گئی ، اور گھوڑا بدکنے لگا ، رنگین روشنیاں

فہ ہوتیں تو رنگ برنگ کی پرچھائیاں بھی فہ ہوتیں،
 دوست نے پوچھا یہ کیا کرتے ہو، میں نے کہا ”اسہاے صفات
 پیدا کرتا ہوں، نتیجہ تم دیکھ لو“ رنگین قندیلیں اچھی
 صفتیں ہیں، پرچھائیاں بری صفتیں ہیں، اُس کا نام
 مٹا دو تو اس کا نشان بھی نہ رہے۔ من کی روشنی سندسار
 کے ہیر پھیر کے لئے کافی ہے، دیکھیں اس پھیلی کو کون
 بوجھتا ہے۔

من - موجی

باقی آئندہ۔



داس بحیثیت شاعر

از

(گوکل داس طالب علم ایف۔ اے سال دوم)

چت رنجن داس کے بڑے پیشوا اور دیشبندھو اور لایق وکیل ہونے کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ہم کو اس مضمون میں صرف اُن کی شاعری سے بحث کرنی ہے۔ آپ کی قربانیاں بہت زیادہ اور آپ کا جذبہ آزادی بہت زبردست تھا۔ لیکن اُن کی ادبی قابلیت کے سامنے یہ جوہر بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔ اگر اُن کی تصنیفات پر سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو بھی یہ بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ آپ اعلیٰ درجہ کی ادبی قابلیت رکھتے تھے اور اگر آپ تھوڑا سا وقت بھی اپنے ادبی ذوق میں صرف کرتے تو ضرور اُس میں بھی آپ نمایاں کامیابی حاصل کرتے۔ اُن میں ساری باتیں سچے شاعروں کی سی تھیں۔ وہ ایک شاعرانہ روح لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ایسی روح جو دیکھتی ہے، ترنم ریز رہتی ہے اور جس کی گہرائیوں میں ہمیشہ جذبات کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں اور والہانہ طور پر اشعار کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی

کہ آپ تہیت بنگالی تھے اور قدرتی طور پر آپ کی طبیعت ایک پاک بنگالی کی سی واقع ہوئی تھی۔ ہم اس کی جھلک اُن کی فیاضی اور نرم دلی اور اُن کے وسیع خیالات میں بھی پاتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے وہ ”شکتی دیوی“ کی حمایت لے سکتے تھے اور زندگی کے کاروبار میں اُس کا اثر پیدا کرتے تھے۔

آپ کبھی زمانہ گذشتہ کے رسم و رواج سے منحرف نہیں ہوئے اور ہمیشہ زمانہ حال کے بہترین رجحانات اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ایک شاہزادوں کا سا دل، شیروں کی سی شجاعت اور عورتوں کی سی ذکی العس طبیعت اور ایک نوجوان کا سا جوش و خروش رکھتے تھے۔ آپ ہمارے ہاں کے قدیم اشرافوں (Aristocrat) کا نمونہ تھے۔ پیدائش، تربیت، تعلیم، مزاج سب کچھ اشرافوں کا سا تھا۔ اُن کی ہر بات میں ایک شاہانہ جلال پایا جاتا تھا۔ خواہ دولت کی فراہمی ہو یا ترک لذات، پر جوش خطابت ہو یا سنجیدہ خاموشی، نظم ہو یا نثر، ہر چیز میں اس کی جھلک موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنگالی ادب میں آپ نے ایک حیات تازہ پھونکی اور ساگر سنگیت کا سا نظموں کا مجموعہ اپنی یادگار چھوڑا۔

ساگر سنگیت بنگالی زبان میں ہے اور خود مصنف ہی نے اس کا انگریزی ترجمہ بحر ترنم (Song of the Sea) کے نام سے کیا ہے۔ ارنبدو گھوش نے اس کا منظوم انگریزی

ترجمہ کیا ہے۔ ان دونوں کی روح میں ایک قسم کا لگاؤ پایا جاتا ہے۔ دونوں کی غم و خوشی میں ایکساں حالت ہوتی ہے۔ اگر ایک طرف داس کی لرزتی ہوئی آواز نے گھوش کے پاک اور روشن نام سے داغ بد نامی مٹایا تو دوسری طرف گھوش کے جذبات کی جھلک سے داس کے گیتوں میں جادو بھرا اثر پیدا ہو گیا۔

اس کتاب میں تقریباً چالیس نظمیں ہیں اور ان سب کا مشترک موضوع سمندر ہے۔ شاعر صرف سمندر کے متعلق گاتا ہے، صرف سمندر کو دیکھتا ہے اور سمندر ہی کا خیال کرتا ہے، اسے خواب میں بھی سمندر دکھائی دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گیت اُس کی روح کی تہ میں پہنچ چکا ہے اور اس کے وجود کی بنیاد تک سرایت کر چکا ہے۔ اُس کے کاسہ دل میں غم و خوشی دونوں یکساں جھلکتے نظر آتے ہیں۔ دریا کی لہروں کے مانند اُس کے دل میں مختلف جذبات لہراتے رہتے ہیں اور ظاہر ہونے کے لئے تڑپتے ہیں اور ان گیتوں کی شکل میں باہر آتے ہیں۔ اس لئے مصنف سمندر ہی کے مختلف اوقات کے مختلف نظاروں کے گیت گاتا ہے۔ اُس نے سمندر کا طلوع آفتاب کا، غروب آفتاب کا، صبح کا، دوپہر کا، رات کا، نہایت ہی عمدہ منظر کھینچا ہے۔ سمندر کی سب حالتیں اُس کی عظمت، نور و ظلمت، تاریکی، سکون، طوفان، سب کا نقشہ کھینچا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھئے کہ صرف بیان ہی سے شاعر کی تشفی ہو جاتی ہے۔ وہ صرف لفظی تصویریں اور

کیہرے کی طرح ہو بہو فرقتو کھینچنے کا شوقین نہیں ہے۔ اُس کی نظر صرف حسن ظاہری سے آسودہ نہیں ہرتی بلکہ نقاب اُٹھا کر پس پردہ جو جھلک ہے اُسے دیکھنا چاہتی ہے۔ اُس کی کوشش ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ سہندر کے دل کے بندھنوں کو کھول دیا جائے اور اُس کی روح کا بر ملا نظارہ کیا جائے۔ اُس کو ہمیشہ سہندر کی عجیب و غریب شخصیت کی تلاش رہتی ہے۔ عام طور پر یہ شخصیت بھاگتی اور بچتی پھرتی ہے اور آسانی سے قابو میں نہیں آتی۔ لیکن اس کے باوجود ان کے گیتوں کے جال سے یہ نہ بچ سکی اور سہندر الفاظ میں مقید ہو گیا۔ اُس کی روح ہمیشہ سہندر کی روح کے ساتھ ہم کلام رہتی ہے اور جس طرح کہ ایک سارنگی سارنگئے کی انگلیوں کے مس سے مترنم ہو جاتی ہے اسی طرح سے ان کا دل سہندر کی روح سے خود ایک بحر ترنم بن جاتا ہے۔

اب سہندر کی آواز خواہ میدان میں بہنے والے نالے کی طرح دھیمی اور نرم ہو یا اس میں بادلوں کی سی گرج پائی جائے۔ خواہ اُس کا اثر شراب کی طرح کیف آور ہو یا شہد کی طرح حلاوت رکھنے والا، خواہ اُس میں اُن آنسوؤں کا سا سوز و گداز پایا جائے جو کسی کی آنکھوں سے بہتے ہیں، ان سب مختلف حالتوں کے پیچھے شاعر کو ایک ہی ہستی جلوہ افگن نظر آتی ہے۔ وہ اُسے دیکھتا ہے اور بیتا بانہ پکار اُٹھتا ہے۔

”تیرے گانے میں یہ کون سے شبہ ہیں، تیری راگنی

کیا ہے۔“

”تیری گہرائیوں میں کون سی روح بستی ہے جو تیرے
بہیس میں آکر ہنستی اور روتی ہے“
”وہ کون سا خیال تجھ میں چھپا ہوا ہے جو ہمیشہ
اُبھرا کرتا ہے۔“

اب ایک دوسرے نظارے پر توجہ کیجئے۔ صبح کا وقت ہے۔
افق پر ہلکی ہلکی سفید روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ شاعر کان
لگا کر سمندر کے دل آویز نغموں کو سنتا ہے۔ جو راگ بلند
ہوتا ہے وہ اس کے دل میں بھی سما جاتا ہے۔ اُسے محسوس
ہونے لگتا ہے کہ جھاگ کی تہ کے نیچے ضرور کوئی ایسی روح
محو ترنم ہے جو اب تک کالبد خاکی میں نہیں آئی۔ یا یہ کہ
”کوئی آواز ضرور اس میں ایسی ہے جو سمندر سے بلند
ہو کر تھام فضا کو موسیقی میں بدل رہی ہے۔“

لیکن جب شاعر کی سمجھ میں سمندر کا یہ بہید نہیں
آتا تو وہ بے اختیار ہو کر پکار اٹھتا ہے ”اے لامحدود
آواز۔ او مجھے پکارنے والی روح اگرچہ میں تجھ سے واقف
نہیں ہوں، تجھے دیکھ نہیں سکتا، لیکن پھر بھی تیرے
نغموں سے متاثر ہو کر میرے اعضا میں ایک خوش گوار اور
زبردست لرزش پیدا ہو جاتی ہے۔“

داس حسن مجسم کا جو یا بھی ہے۔ سمندر کی پر اسرار
روح سے وہ پریشان ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بچکر وہ
اس کے نغموں کے الپ میں محو ہو جاتا ہے اس کے ذیل کے
اشعار پر غور کیجئے۔

”تہوار کا دن ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ سورج کی سنہری تڑپتی ہوئی کرنیں سمندر کی لہروں پر رقص کرتی ہیں اور ان سنہری زنجیروں کی طرح معلوم ہوتی ہیں جو کسی حسین کے پاؤں کو زیب دے رہی ہوں۔ سمندر کی آواز میں پر لگ جاتے ہیں اور پانی کے ذخیرے کی بجائے اب وہ ایک گانے والی شاما بن جاتا ہے۔“

سہاں تو یہ ہے لیکن شاعر کا دل بے چین ہے۔ اس کے دل پر بوجھ ہے۔ وہ خود نہیں جانتا کہ یہ بوجھ فرحت و انبساط کا ہے یا حزن و ملال کا۔ اس کے پاس اپنی اس قلبی کیفیت کے لئے کوئی نام نہیں۔ وہ بیتابانہ پوچھ اٹھتا ہے۔

”اے سمندر اس تہوار کے دن جب کہ تیری مسرت مجھے باہر کھینچ لائی ہے، میرے دل کی گہرائیوں میں افکار کا ایک بوجھ ہے میں اسے کہاں اتاروں“

اب افق پر اور زیادہ تیز روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ سمندر کی ہر لہر جو اُٹھتی ہے ایک عجیب و غریب نغمہ لئے ہوئے آتی ہے۔ فضا اس نغمہ کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے ہوا بھی اُسی کو لاپتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام دنیا میں ایک نغمہ زریں پھیلا ہوا ہے ایسا نغمہ جو ایک لمبے سنہری تار کی طرح کہیں سے بے جوڑ نہیں ہے۔ شاعر کا دل بھی اس نغمہ سے لبریز ہو جاتا ہے وہ بھی الاپ اُٹھتا ہے۔

”میرا دل ایک سارنگی بن گیا ہے۔ اس کے ہزاروں

تاروں سے تیرے سروں کی صدا آتی ہے تیری انگلیوں کے
 مس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس سارنگی کی جو تان ٹوٹتی ہے
 اُس میں تیری عظمت اور جلال کا ذکر ہوتا ہے۔ تیری
 رات بھی عجیب و غریب ہے تیری روشنی بھی پر اسرار
 ہے۔ اے سمندر۔ اے روح اس نور و ظلمت میں تو اپنی
 اس سارنگی کو ایکساں بچائے جا۔“

ان ناظرین کی سہولت کے لئے جنہوں نے اس کے جذبات
 کو اصل یا ترجمہ کی شکل میں اب تک نہیں دیکھا ہے ہم
 بششور پرشاد منور کا ساگر سنگیت کا تھوڑا سا اردو
 ترجمہ اور مولانا سلیم صاحب کا منظوم اردو ترجمہ ذیل
 میں دیتے ہیں یہ اقتباسات معزز رسالہ زمانہ سے لئے
 گئے ہیں۔

”آسمان پر آج کوئی صدا باز گشت نہیں کرتی۔ تمام دنیا
 پر سکوت کا عالم طاری ہے اے ذات غیر محدود۔ تیری
 زبان حال پر بھی ایک لفظ نہیں آتا۔“

”ہنگام شام کی بارش تجھ پر اپنے سکون بخش اثرات
 ڈال رہی ہے اور تو اسوقت نہایت امن و طہارت کے ساتھ
 بے حرکت اور خاموش لیٹا ہوا ہے رات کی پہلی زرد زرد
 کپھا میں گر کر تیرا راگ خاموش ہو گیا۔“

”تیرے لعیم و شعیم کالبد میں ایک مستی خیز سرور
 سے چار سو لپٹ کر میرا چھوٹا سا کاشانہ رنج و راحت
 تو با جا رہا ہے اور ”فطرت“ خاموش اور دلفریب
 کنوں کے مانند تیری جانب تیر کر دوری آرہی ہے اور

موت اور کال عالم حسرت میں پابستہ تیرے قدم پر
گزر رہے ہیں۔

”کوئی طاقتور مرتاض اس دقت میرے سینے پر آسن
جہاں بیٹھا ہوا ہے اور کس طرح۔ یکسو حبس دم میں
مشغول۔ خاموش۔ آنکھیں بند کئے ہوئے بالکل بے حرکت۔
”اے بعد ناپیدا کنار مگر میں نے اس کی تنویر کا نظارہ
کر لیا ہے۔ گو اُس کی ذات تک میری رسائی نہیں ہوئی۔
میں خاموشی سے چشم براہ ہوں۔ مجھ کو بھی غیر صوری
روح بنا کر اپنی روح میں وصل کر لے۔ ہم دونوں ذات
واحد ہو جائیں۔ دہائی نہ باقی رہے۔

—————:o:—————

ترجمہ منظوم از پروفیسر وحید الدین صاحب سلیم

آ اے کہ تری ہر لہر سدا
مشغول ہے قطرہ نوازی میں

قو مست ہے عشوہ طرازی میں
میں گم تری شعبدہ بازی میں

تو نور و ضیا کا سہندر ہے
طلعت سے بھری ہستی ہے مری

تو سوچ پہ ہے، تو اوج پہ ہے
مشتاق تری، پستی ہے مری

اس وقت کہ دنیا نیند میں ہے
ہنسناں ہے سطح سہندر کی

ہے چاندنی پھیلائی چار طرف

دلچسپ فضا ہے منظر کی

کیا سچ ہے کہ تو بھی جلوہ نہا

ہے جلووں کے اس منظر میں

کیا تیری نشیلی آنکھوں نے

مستی یہ بھری ہے سہندر میں

یہ سچ ہے تو تال اے حسن ازل

پرتو مرے اس غمخانے پر

مشتاق ہوں تیرے کرشمے کا

ہوں شیفتہ تیرے ترانے پر

پہناؤں گا جامہ نظم کا میں

جب اپنے دل کی صداؤں کو

رگ رگ میں برنگ برق تپاں

دوراؤں گا تیری اداؤں کو

اے مطرب روح ہو جلوہ فگن

پھر آج شب تنہائی میں

ہے چھیڑتا اپنے ترنم کو

تو روحوں کی گہرائی میں



عذر گناہ

(ذیل میں ہم اپنے اُن عزیز طلبہ کا خط چھاپتے ہیں جو گزشتہ سال پہلی بار ہمارے کالج سے کامیاب ہو کر کلیئہ جامعہ عثمانیہ میں شریک ہوئے۔ اس حسرت بھرے خط کو پڑھ کر ہمیں اور اُن کے پروفیسروں کو جس قدر افسوس اور رنج ہوا اس کا اظہار اس وقت بے موقع ہے۔ ہمیں خود حیرت ہے کہ جب ہم جشن یوم کلیہ کے لئے اپنے دوستوں اور ہمدردوں کو دعوت دے دے کر بلا رہے تھے تو اپنے عزیزوں کو کیوں بھول گئے۔ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ انسان کی نظر دور دور کی خبر لاتی ہے اور قریب کی چیزوں سے چوک جاتی ہے۔ اسی طرح اکثر ایسا ہوا ہے کہ آدمی غیروں کی خاطر مدارات میں اپنے عزیز و اقارب کو بھول جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ خود مہذبان ہوتے ہیں۔ ہم اس جشن کی تیاری اور انتظامات میں اس قدر مصروف تھے کہ ہمیں یہ خیال بھی نہ آیا کہ جو اس خوشی کے سب سے زیادہ مستحق ہیں انہیں بلائیں اور شریک کریں۔ یہ عذر نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی عذر پیش ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہم اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہیں اور اس

پر نادم ہیں۔ کہ اب اس کی کوئی تلافی بھی
 نہیں ہو سکتی سوائے اس کے کہ ہم اُن عزیز طلبہ
 کے خط کو (جس میں ادبی شان بھی ہے اور
 محبت کی رنگ و بو بھی) چھاپ کر اپنے قصور کا
 علی الاعلان اعتراف کریں۔ ہم اُن کے مسنون ہیں
 کہ گو ہم ایک وقت پر انہیں بھول گئے مگر وہ
 ہمیں نہیں بھولے اور یہ سبق انہوں نے ہمیں ایسا
 دیا ہے جو ہم کبھی نہ بھولیں گے۔ (ادیتزر)

----- () -----

۱۱ آذر سنہ ۱۳۳۵
 یوم جمعہ

مسرت منزل

ہماری سالگرہ

اے مادر علمی (اورنگ آباد کالج) تیرا آغوش علم
 آموز کچھ ہی قبل ہم سے خالی ہوا ہے۔ ابھی ابھی تو نے
 ہم کو ایک دوسری علمی دایہ کے سپرد کیا ہے۔ تو نے اپنی
 صفحہ یاد سے ہمیں اتنی جلد متا دیا۔ کیا کسی ماں نے اپنے
 بچوں کے ساتھ ایسا کیا ہے؟

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انہیں بھول گئے

ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

لیکن نہیں ہم نہیں بھولے۔ ہمارے دلوں میں یاد

تازہ، محبت جوش زن ہے ہم وعدہ کرتے ہیں، یقین دلاتے

ہیں تیری الفت ہمارے دلوں سے مت نہیں سکتی، لیکن

افسوس کہ وہ بھلائے گئے۔

آج اتفاق سے (جب کہ ہماری سالگرہ کی تقریب میں ایک عظیم الشان محفل منعقد ہونے والی ہے) ہم کو معلوم ہوا کہ سالگرہ کی خوشیاں منائی جائیں گی، ایک علمی محفل ہے، علم دوست، علم پیشہ، علم پرور حضرات اس محفل کو زینت بخشیں گے۔ تیاریاں خاص طور پر کی گئی ہیں، آج وہ دن ہے جب اُردو کا گہوارہ، مشہد کہن عالم گیر کی یادگار اورنگ آباد جس قدر فخر کرے بجا ہے۔ اس دیار حسرت آثار کا آج ذرہ ذرہ روکش آفتاب ہے۔ یہ کب معلوم ہوا؟

ہم اسیران قفس کو تب خبر دی تو نے آہ
لت کئے جب باغ میں پھولوں کے خرمن اے صبا
قسمت ان جرعه نوشوں کی جو اس محفل میں شریک
ہیں، محفل ہماری، ساقی ہمارا، اس پر دیکھئے نیرنگی
تقدیر کہ تشنہ لب ہم ہیں۔ غیر سرشار و مست اور ہم
مضطرب و بے قرار!

کس قدر پریشان کن، افسوس ناک اور اضطراب خیز
ہے ہماری سالگرہ کی مبارک باد! دوستو! ہماری قسمت
پر ماتم کساری کرو۔ کاش ہم کو ایک روز قبل اس کا علم
ہوتا، اس عظیم الشان علمی جلسہ کی ایک روز پہلے خبر
ہوتی۔ ہم فوراً پہنچ جاتے محفل میں شریک ہوتے۔ مادر
کی زیارت، ساقی کی قدمبوسی کا شرف حاصل کرتے۔ وقت
گذر گیا۔ قلق ہے، دل پریشان، خاطر رنجیدہ ہے۔ اب بھی
گرجوش اشتیاق میں چل کھڑے ہوں، وہاں پہنچیں تو

تَر رہے کہ قسمت کے دھنی کہیں یہ نہ کہ اُتھیں۔

حالی نشاطِ نغمہ و مے تہو نڈتے ہوا ب

آے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

بس اب کفِ افسوس ملتے رہئے۔ وقت کا سانپ نکل گیا۔

لکیر پیٹا کیجئے۔ اب ایک توقع ہے کہ کوئی اس محفل کا

ذکر کرے اور ہم نصف العیش کے مزے لیں۔ اس طرح سرور

ہوں اور دعا کریں کہ اس مادرِ علمی کے گود میں پلنے

والے ہمارے بھائی خوش اور شاد کام رہیں۔

ان دوستوں سے ہمدردی ہے جو ہم سے حرماں نصیب

ہیں۔ اُن کی خدمت میں مبارک باد کا تحفہ پیش ہے جو

اس میں شریک ہیں۔ ان خوش مستوں سے ہم 'عمر خیام

کی رباعی میں گزارش کرتے ہیں۔

یاراں چو باتفاق میعاد کنید

خود را بجهال یک دگر شاد کنید

ساقی چو مے مغانہ در کف گیرد

بیچارہ فلاں را بدعا یاد کنید

حرماں نصیب

قدیم طلباءِ کلیہ : اورنگ آباد)



نکاح بالجبر

(یہ ایک مجلس (act) کا بزمیہ فرائس کے مایہ ناز ڈراما نویس مولیر (Moliere) کی تصنیف ہے ، سنہ ۱۶۳۳ میں تصنیف ہوا ، اور اسی سال کھیلا گیا ، مرزا نوشہ کا سانگ خود مصنف نے بہرا ، اور شاہ لوی چہار دہم جوتشی بذا تھا ، علمی حیثیت سے بھی یہ تمثیل دلچسپ ہے ، جس زمانہ میں یہ لکھا گیا وہ وہ زمانہ تھا کہ جامعہ فرائس نے یہ قانون نافذ کیا تھا کہ جو شخص اشراقی فلسفہ پر اعتراض کرے ، اور ارسطو کو برا بھلا کہے ، وہ گردن زدنی قرار دیا جائے ، مصنف کی جرأت قابل داد ہے ، ہم نے اسے ” ایٹانے “ کی پوری کوشش کی ہے ، علامہ خجندی ، حکیم چلبی ، مرزا صمصام ، مرزا نوشہ سب اصل کا چربہ ہیں ، اسے کلیہ کے اساتذہ نے کیا تھا ، وجہ ظاہر ہے ، طلبا اس تمثیل کو کامیابی کے ساتھ نہ کر سکتے تھے ، ہمیں امید ہے کہ نمونہ کے طور پر یہ تمثیل ہر کالج کے لئے مفید ہوگی ، اس نوعیت کا ڈرامہ اردو زبان میں اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ ادیٹر)

پہلا سین

(مرزا نوشہ پردے کے پیچھے سے کہتا ہوا باہر آتا ہے)
 دیکھو جی، میں ابھی ذرا دیر میں واپس آتا ہوں،
 مکان تھیک تھا کہ رہے، ہر کام اپنے اپنے وقت پر ہو، اور
 ہاں، دیکھو اگر کوئی شخص روپیہ لے کر آئے تو مجھے فوراً
 جعفر صاحب کے گھر سے بلا لینا، اور جو کوئی روپیہ مانگنے
 آئے تو اس سے کہہ دینا کہ میں باہر گیا ہوں اور آج واپس
 نہ آؤں گا۔

جعفر: (مرزا نوشہ کا آخری جملہ سن کر ماشاء اللہ،
 بہت معقول حکم ہے۔)

مرزا نوشہ: (جعفر کو دیکھ کر) آخا بھائی جعفر صاحب،
 خوب آئے، میں ابھی آپ ہی کی طرف
 جا رہا تھا۔

جعفر: کیوں، خیر تو ہے۔

مرزا نوشہ: جی کچھ نہیں، آج کل میں کچھ فکر میں
 ہوں، اسی کے متعلق آپ سے مشورہ کرنا تھا۔

جعفر: میں حاضر ہوں، شوق سے فرمائیں، ہم لوگ
 یہاں بیٹھ کر اطمینان سے گفتگو کر سکتے ہیں۔

مرزا نوشہ: (کرسی پر ہاتھ کر، اور خود ایک کرسی لے کر)
 تو آپ مخلص بالطبع ہو جائیے، ہاں صاحب آج

کل ایک نہایت اہم سوال میرے زیر غور ہے،
 اور آپ جانئے مخلص احباب سے مشورہ کر لینا

ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔

جعفر: عزت افزائی ہے، کہ یہ شرف مجھے ملا، ہاں

تو بسم اللہ، میں ہمہ تن گوش ہوں —

مرزا نوشہ: لیکن جعفر صاحب، ایک شرط ہے، اپنی راے

بلا رو رعایت پیش فرما دیجئے گا، منہ دیکھی

باقی نہ ہوں —

جعفر: آپ کی مرضی ہے تو مناسب ہے، مجھے کوئی

عذر نہیں —

مرزا نوشہ: نہیں صاحب پہلے اقرار کر لیجے —

جعفر: آپ کی دوستی کی قسم میں سچی سچی راے

دوں گا، لے اب کہہ چلئے —

مرزا نوشہ: (سنبھل کر بیٹھ کر، اور حلق صاف کر کے)

بات یہ ہے کہ میں آپ سے یہ مشورہ لینا چاہتا

ہوں کہ آیا، شادی کرنا میرے لئے مناسب

ہوگا یا نہیں —

جعفر: چونک کر) کیا فرمایا! شادی، کس کی،

آپ کی؟

مرزا نوشہ: ہاں ہاں صاحب میری شادی، اسی کے متعلق

تو آپ سے مشورہ کر رہا ہوں —

جعفر: (کچھ دیر تھیر کر) مرزا صاحب، گستاخی

معاف پہلے مجھے کچھ پوچھ لینے دیجئے

مرزا نوشہ: ضرور دریافت فرمائے —

جعفر: (ذرا رک رک کر) کیوں مرزا صاحب، آپ

کے خیال میں، آپ کا.... سن مبارک.... کیا ہوگا۔

مرزا نوشہ: میرا سن؟

جعفر: جی ہاں —

مرزا نوشہ: کیا عرض کروں، بات یہ ہے کہ خود مجھے تھیک سے یاد نہیں —

جعفر: کچھ نہیں تو ۵۲، ۵۳ کے پیٹھے میں تو آپ ضرور ہوں گے —

مرزا نوشہ: کون، میں! نہیں صاحب، یہ آپ کیا فرماتے ہیں، کہیں ایسا ہو سکتا ہے —

جعفر: خیر، لیکن چونکہ آپ مجھ سے صاف گوئی کا

اقرار لے چکے ہیں اس لئے عرض کرتا ہوں،

معاف کیجئے گا، مرزا صاحب! میری مخلصانہ

راے تو یہ ہے کہ اب آپ کی عمر شادی کی

رہی نہیں۔ مختصر الفاظ میں اپنی راے عرض

کرتا ہوں، کہ اب آپ خانہ آبادی کے خراب نہ

دیکھیں، اتنے دنوں تک آزاد رہنے کے بعد

اب اس بھاری زنجیر کو اپنے ہاتھوں اپنے

پانوں میں ڈالنا، آپ کی دانائی سے بعید ہے۔

مرزا نوشہ: (کسی قدر جوش سے) تو جعفر صاحب، میں

بھی صاف صاف عرض کئے دیتا ہوں کہ

بندہ نے تو شادی کی پوری نیت کر لی ہے

اور جو لڑکی میری نظر میں ہے، اس سے نکاح

کرنا کچھ ایسی نادانی کی بات بھی نہیں۔

جعفر: ہاں تو یہ اور بات ہے، آپ نے مجھ سے اب

تک یہ تو کہا ہی نہ تھا۔۔۔

سرزا نوشہ: میں اسی لڑکی کو ہر طرح سے پسند کرتا ہوں

میں اس پر سو جان سے فدا ہوں۔

جعفر: سو جان سے فدا ہیں؟

سرزا نوشہ: بے شک، اور میں اس سے گفت و شنید بھی

کر چکا ہوں

جعفر: یہ مرحلہ بھی طے ہو چکا ہے

سرزا نوشہ: اجی آپ سنئے تو، آج رات کو نکاح ٹھہر چکا ہے

اور میں زبان دے چکا ہوں۔

جعفر: یہ صورت ہے! نہیں صاحب، پھر تو ضرور

شادی کیجئے، اب اس میں کچھ کہنے کی

گنجائش نہیں ہے۔

سرزا نوشہ: بھلا آپ ہی انصاف سے فرمائے کہ میں اس

قصد سے کیوں کر دست بردار ہو جاؤں، کیوں

جعفر صاحب، ایک بات دریافت کرتا ہوں،

کیا اب میں اتنا ستھیا گیا ہوں کہ بیوی کا

خیال تک نہ کروں! دیکھئے! آپ میری عمر

پر نہ جائیے گا، واقعات پر نظر ڈالئے، کسی

تیس برس کے جوان کو مجھ سے بھڑا لیجئے

انشاء اللہ پھرتی اور تازگی میں آپ مجھ

اس سے کچھ بیس ہی پائیں گے۔ آخر مجھ

میں نقص ہی کیا ہے! کیا میرے اعضا جواب

دے چکے ہیں، کیا میں چلنے پھرنے سے عاجز

اور گاڑی سواری کا محتاج ہو گیا ہوں،
عجیب دنیا ہے —

جعفر : (جلدی سے) نہیں صاحب آپ بالکل بجا فرماتے
ہیں، مجھے واقعی اس کا خیال نہ رہا تھا،
آپ ضرور شادی کریں۔ اس سے اچھی کوئی
بات ہو ہی نہیں سکتی —

مرزا نوشہ : ایک زمانہ ایسا تھا جب میں بھی اس خیال
سے کچھ گھبراتا تھا۔ لیکن اب اس کی تائید
میں میرے پاس کافی وجوہ موجود ہیں،
پہلی وجہ تو یہ کہ جب میں تھک جاؤں گا تو
میری خدمت اور سیوا کرنے والی، مجھے دلاسا
دینے والی، ایک رفیق زندگی موجود ہو گی،
اجھا اس کو بھی جانے دیجئے تو سب سے بڑی
بات یہ ہے کہ میرے مجرد رہنے سے اندیشہ ہے
کہ کہیں میرے خاندان کا چراغ دل نہ ہو جائے
میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ آپ کی
راے بہت صائب ہے بلکہ میرا مشورہ تو یہ
ہے کہ اب اس کار خیر میں دیر نہ لی جائے۔
مرزا نوشہ : سچ کہئے! کیا واقعی یہ آپ کی سچی راے ہے۔
جعفر : یقین مائے نہ میں صحیح عرض کر رہا ہوں،
اس سے اچھی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی —
مرزا نوشہ : خوش ہو کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ
نے اپنے مخلصانہ مشورہ سے سرفراز فرمایا —

جعفر: ہاں صاحب، یہ تو فرمائے کہ یہ معزز خاتون
ہیں کون —

مرزا فوشہ: مرزا عسکری کی صاحبزادی شکیاہ، مرزا
عسکری کو تو آپ جانتے ہوں گے —

جعفر: وہی شکیاہ نہ جن کے شوق اور خوش پوشی کے
بہت چرچے رہتے ہیں —

مرزا فوشہ: جی ہاں وہی —

جعفر: مرزا صہام کی بہن؟ وہی صاحبزادے نہ
جو مونچھوں پر تاؤ دئے ہوئے تلوار باندھے
پہرا کرتے ہیں —

مرزا فوشہ: وہی - وہی - آپ تو جانتے ہیں —

جعفر: (منہ پھیر کر) اللہ رحم کرے —

مرزا فوشہ: ہاں تو اب کیا راے ہے

جعفر: ماشاء اللہ بہت مبارک جو راہ ہے - تو اب آپ
فواغت کر ڈالئے —

مرزا فوشہ: (فخر کے ساتھ) کیوں صاحب، میرے انتخاب
کی آپ داد تو نہ دیں گے —

جعفر: کیا کہنے ہیں - خوب گزریگی، آپ وقت ضائع
نہ کیجئے اور شادی کر ڈالئے —

مرزا فوشہ: آپ کی راے سن کر کمال مسرت ہوئی، آپ
کو بڑی تکلیف ہوئی، تو آج شب میں تو ضرور
تشریف لائے —

جعفر: انشاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا، لیکن لطف

دو بالا کرنے کی غرض سے ذرا بھیس بدل کر
آؤں گا —

(دونوں کہتے ہوئے جاتے ہیں)

مرزا نوشہ: اچھا تو خدا حافظ،

(جعفر جاتے ہوئے سر ہلا ہلا کر ”رام ملائی جوڑی“

”رام ملائی جوڑی“ کہتا ہوا چلا جاتا ہے)

مرزا نوشہ اکیلے میں اپنے دل سے

(”خدا نے چاہا تو یہ تقریب ضرور مسعود ہوگی، ہر

شخص اس سے خوش نظر آتا ہے جس جس سے ذکر کرو وہی

ہنس ہنس کر تعریف کرتا ہے، مجھ سے زیادہ خوش نصیب

آج روئے زمین پر کوئی نہیں “)

ایک لڑکا خط لئے آتا ہے —

مرزا نوشہ خوش ہو کر شعر پڑھتا ہے —

آے قاصد لیای ترے قدموں پر سجنوں ہو نثار

ہے کوش مشتاق سخن ہاں جاد کہہ پیغام یار

(لڑکا سلام کر کے خط دیتا ہے ”سرکار یہ خط چھوٹی

بیوی نے دیا ہے اور زبانی کہا ہے کہ میں آج کپڑا خریدنے

جاؤں گی اور اس کے بل آپ کے پاس بھیج دوں گی —

مرزا نوشہ: سلام کھدینا، کھدینا، میں حاضر ہوں۔ سب

کچھ آپ ہی کا ہے —

(لڑکا جاتا ہے۔ مرزا نوشہ خط پڑھتے ہیں)

شکیہ کے مہربان، شکیہ کی تسلیم قبول کیجئے —

ایک مدت سے میرا ارادہ تھا کہ اپنے ہونے والے

شوہر سے مل کر اُس کے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کروں لیکن اس رسم و رواج کا برا ہو جس نے میرا ارادہ پورا نہ ہونے دیا، اب اس خط کے ذریعہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتی ہوں۔ جس دن سے میں نے یہ سنا ہے کہ میری نسبت آپ کے ساتھ طے پائی ہے مجھے اس کی فکر تھی کہ کسی طرح آپ کے حالات اور خیالات معلوم کروں، چنانچہ جو باتیں مجھے معلوم ہوئی ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ انشاء اللہ ہماری ازدواجی زندگی بہت خوشی سے گزرے گی۔ ابا جان تو آپ جانتے ہی ہیں کہ پرانی لکیر کے فقیر ہیں۔ انہوں نے مجھے ہر طرح سے دبا کر رکھا اور اُبھر نے نہ دیا، میری تعلیم اُن کی پابندیوں کی وجہ سے غارت گئی سو سائقی میں آنے جانے سے انہوں نے مجھے منع کیا، بہر حال خوشی کی بات ہے کہ اب اس قید و بند کا زمانہ ختم ہونے والا ہے اور میرا ہونے والا شوہر ایسا شخص ہے جو روشن خیال ہے اور کبھی میرے معاملات سے تعارض نہ کرے گا (مرزا نوشہ یہ جملہ پرزہ کرچونک اٹھتے ہیں) مجھے یقین ہے کہ جو وقت اس وقت تک گھر کی چار دیواری میں بے کار کٹتا رہا اب سوسائٹی کی چہل پھل میں کٹے

گا، آپ اپنے حلقہ احباب میں اور میں اپنی
 تفریحات میں اپنا اپنا وقت گزاریں گے۔
 میرے تھیٹر، سینما وغیرہ جانے پر آپ کو
 اعتراض نہ ہوگا، نہ میں عام بیویوں کی طرح
 آپ سے اس بات کی توقع رکھوں گی کہ آپ ہر
 وقت میرے پاس بیٹھے رہیں، اور نہ غالباً
 آپ ہی اس پر اصرار کریں گے کہ میں ہر وقت
 گھر میں گھسی بیٹھی رہوں، ہم میں کبھی کوئی
 لڑائی جھگڑا نہ ہوگا۔ نہ آپ مجھے شبہ کی نظروں
 سے دیکھیں گے، اور نہ میں آپ کے افعال کی
 توہ لگاؤں گی، غرض کہ مزے کی زندگی
 گزرے گی۔ میں چاہتی تھی کہ آپ سے مل کر
 خود اس زندگی کے متعلق گفتگو کرتی، لیکن
 وہی رسم و رواج کا سوال درپیش تھا، اس
 لئے یہ عریضہ ار سال خدمت کیا گیا، مجھے جس
 بے چینی کے ساتھ آج کی شب کا، یعنی اپنی
 آزادی کی ساعت کا انتظار ہے، وہ میں
 خود ہی جانتی ہوں —

(مرزا نوشہ خط پڑھتے ہی سر پکڑ کر بیٹھ جاتے)

ہیں۔ پھر اٹھتے ہیں اور تھل کر کہتے ہیں)

”سبحان اللہ! لاحول ولا قوۃ، ایں گل دیگر شگفتہ“

نکاح کی شرطیں کس قدر معقول ہیں۔“

(خط کھول کر پڑھتے ہیں)

”میرا ہونے والا شوہر روشن خیال ہے، کبھی میرے معاملات سے تعارض نہ کرے گا“

”اچھی روشن خیالی ہے“ (غصہ میں خط پھاڑتا تھا ہے)
 ”ابھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے، کوئی ترکیب ایسی کرنی چاہئے جس سے ان مہذب خاتون سے نجات ملے، سمجھہ میں نہیں آتا کہ کس سے مشورہ کروں خوب یاد آیا، جعفر صاحب کے پاس جاتا ہوں۔“

(باہر جاتا ہے، جعفر دوسری طرف سے آتا ہوا دکھائی دیتا ہے)

جعفر: تسلیم عرض کرتا ہوں مرزا صاحب! میں اس وقت یہ کہنے کے لئے حاضر ہوا تھا کہ سروپ مل جوہری کے ہاں ایک بہت اچھی انگوٹھی بکاؤ موجود ہے، ہیرے کی ہے، آپ کی خاطر اس نے قیمت کم کرنے کا اقرار کر لیا ہے، آپ اسے دیکھ لیتے تو اچھا تھا، (رک کر اور مرزا صاحب کی طرف غور سے دیکھ کر) خیر تو ہے، آپ کچھ خلافت معمول متفکر نظر آتے ہیں۔

مرزا صاحب: (آہستہ سے) جی کچھ نہیں، صرت سر میں درد ہے، ہاں، تو انگوٹھی کے بارے میں ابھی کوئی جلدی نہیں ہے، پھر دیکھ لی جائے گی۔

جعفر: (تعجب سے) پھر دیکھ لی جائے گی! اجی

صاحب آپ تو آج شادی کرنے والے تھے، یا تو یہ شورا شوری یا یہ بے فہمی۔

مرزا نوشہ: کیا عرض کروں، بات یہ ہے کہ اب مجھے خود کچھ شامل سا ہونے لگا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے اس معاملہ کی اچھی طرح چھان بین کر لوں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ بندہ خواب کا بہت کچھ قایل ہے، اور صبح ہوتے جو خواب دیکھ جاتے ہیں، وہ ضرور سچے ہوتے ہیں۔ اب جو میں نے غور کیا تو مجھے یاد آیا کہ آج صبح میں نے خواب دیکھا تھا کہ میں ایک جہاز میں سوار ہوں اور سمندر میں طوفان اٹھا ہے، پھر کیا دیکھتا ہوں کہ —————

(بات کات کر) مرزا صاحب! آپ کا قطع کلام جعفر: ہوتا ہے، معاف فرمائے۔ اس وقت مجھے بہت ضروری کام درپیش ہے، اس لئے زیادہ نہیں تھہر سکتا۔ باقی رہی خواب کی تعبیر، تو آپ اس کے متعلق اتنا پریشان فہم ہوں، یہ واہمے کے کرشمہ ہیں اور آپ اگر تعبیر چاہتے ہی ہیں تو خود آپ کے پڑوس میں دو حکیم اور فلسفی رہتے ہیں۔ یہ بزرگ معقولات اور منقولات و منطق و فلسفہ وغیرہ میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔ ان سے ضرور مل لیجئے، تو اب آداب عرض کرتا ہوں، شب میں حاضر

ہوں گا۔

(چلا جاتا ہے)

مرزا نوشہ: خیر دو فلاسفروں کا تو پتہ ملا، خراب کی تعبیر کا تو بہانہ تھا، لیکن موجودہ صورت میں ان بزرگوں سے مشورہ کر لینا ضرور مفید ہوگا۔

————— : 0 : —————

۱۱۔ سرا سین۔ حکیم العصر علامہ خجندی کا مکان (مرزا نوشہ داخل ہوتا ہے، علامہ خجندی نے اُسے نہیں دیکھا، تہلکتے جاتے ہیں اور دروازہ کی طرف منہ کئے ہوئے زرد زرد سے باتیں کر رہے ہیں)

فاسفی: بس صاحب بس، اب آپ تشریف لے جائیے، عجیب معجزوں، العقل لوگوں سے سابقہ پڑا ہے آپ استقرا کے لوازم و طرق سے ناواقف محض ہیں۔ معقولات کی آپ کو ہوا تک نہیں لگی ہے آئے وہاں سے بحث کرنے کے لئے (میز پر ہاتھ مار کر) اگر میرا بس چلے تو ایسے عوام کا انعام کو اس ارض المعقولات سے خارج کر دوں۔

مرزا نوشہ: شکر ہے کہ یہ بزرگ مل تو گئے، ان سے ضرور مشورہ ملے گا۔

فلسفی: (اسی طرح اور سرزا نوشہ کو نہ دیکھ کر)

میں اسے ثابت کر سکتا ہوں، آپ ہیں کس خیال میں۔ میں دلائل حقہ و براہیں قاطعہ سے ثابت کر سکتا ہوں، حکیم الحکما ارسطا طالیس یوفانی کی اسناد پیش کر سکتا ہوں کہ آپ جہل بسیط و جہل مرکب میں گرفتار ہیں نہ صرف جاہل، بلکہ اجہل ہیں، مجہول العقل ہیں، ظلوماً جہولاً میں سے ہیں، بہ ہمہ اسالیب و ضروب جاہل مطلق ہیں۔

مرزا نوشہ: (دوسری طرف منہ پھیر کر) معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے لڑ پڑے ہیں (پاس جا کر) آداب بجا لاتا ہوں۔

فلسفی: (اسی طرح سے) اور اب بھی مرزا نوشہ کو نہ دیکھ کر) آپ علی الزعم خود، اپنے آپ کو بحث کے قابل گردانتے ہیں، لیکن استدلال کی اولیات سے بھی واقف نہیں ہیں۔ یا للعجب!

مرزا نوشہ: غصہ کی وجہ سے انہوں نے مجھے بھی نہیں دیکھا (فلسفی سے) حضرت!

فلسفی: (اسی طرح سے) میں تھام فلاسفہ، حکما و متکلمین کے بیان سے آپ کے قضیہ کی تغلیط کر سکتا ہوں۔

مرزا نوشہ: (الگ) معلوم ہوتا ہے بہت زیادہ برہم ہیں۔ (فلسفی سے) مولانا!

فلسفی: (اسی طرح غصہ میں) خود غلط، املا غلط،
افشاء غلط۔

مرزا نوشہ: (آگے برہ کر) تسلیم عرض کرتا ہوں حضور
فلسفی: (چونک کر) ارشاد!

مرزا نوشہ: جناب کی اجازت ہو تو.....

فلسفی: (مرزا کی طرف سے منہ پھیر کر) آپ کو کچھ
معلوم بھی ہے کہ آپ کن قیاسات منطقی نے
مرتکب ہوئے ہیں۔ آپ قیاس عاطفہ منفصاء،
و متراکمہ و منوی الکن و عامتہ الورد
میں گرفتار ہیں.....

مرزا نوشہ: جناب مولوی صاحب!

فلسفی: (اسی طرح) آپ کا کبروی جاہلانہ ہے، آپ کا
صغریٰ ابلہانہ ہے، اور نتیجہ اپنی حماقت
آمیزی میں مقید الہتال ہے۔

مرزا نوشہ: حضرت خدا کے واسطے.....

فلسفی: میں داعی اجل کو لبیک کہنے کے لئے تیار ہوں،
لیکن آپ کے قضیہ کو ہرگز ہرگز ابدالاباد
تک تسلیم نہیں کر سکتا (دوات اٹھا کر)
جب تک اس مداد الاسود کا ایک قطرہ بھی
باقی رہے گا، میں براہین قطعی سے آپ کی
تردید کروں گا۔

مرزا نوشہ: حضرت قبلہ۔

فلسفی: آپ ہیں کس مغالطہ میں۔ میں بالعقل و النقل

بالہجاء لہ و الہبہا ہاد اپنے قضیہ پر مستقل

رہوں گا۔ السعی منی والاقہام من اللہ —

مرزا نوشہ: (زبردستی سامنے آکر) یا ابوالارسطا طالیس

کیا یہ بندہ کھترین اس برہمی مزاج کی وجہ

دریافت کر سکتا ہے —

فلسفی: (غصہ سے مرزا کو دیکھ کر) میرے پاس اس

کی معقول ترین وجوہات ہیں۔

مرزا نوشہ: کچھ تو ارشاد ہو —

فلسفی: کیا عرض کیا جائے۔ مرزا صاحب بیان کرنے

سے جگر شق ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ آج کل یہ

دنیا مصدر انتشار و محل فساد ہو گئی ہے۔

نظام کائنات درہم برہم ہونے کو ہے۔ عوام

کالا لغام کی دریدہ دھنی اور جسارت حد اعتدال

سے متجاوز ہو گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ

شہر کے ارباب حل و عقد ایسی باتوں کے وقوع

و صدور کی اجازت دینے سے پہلے غریق بحر

انفعال و خجالت کیوں نہیں ہو جاتے —

مرزا نوشہ: جناب کچھ ارشاد تو فرمائیں۔ آخر وہ بات کیا ہے۔

فلسفی: بات، اجی حضرت سنا ہے سنا ہے، واقعہ

فاجعہ ہے۔ لوگ علانیہ ”توپی کی صورت“

کہتے پھرتے ہیں۔ مجھے استعجاب ہے کہ منتقم

حقیقی ان سے بدلہ کیوں نہیں لیتا۔ کہیں توپی

کی بھی صورت ہوتی ہے —

مرزا نوشہ: (تعجب سے فلسفی کو دیکھ کر) کیوں جناب،

اس جہاں میں کیا خرابی ہے —

فلسفی: (مرزا نوشہ کو گھور کر) مرزا صاحب، عاصی

کا دعویٰ ہے کہ ہم کو توپیی کے لئے ”شکل“ کا

لفظ استعمال کرنا چاہئے نہ کہ صورت کا۔ صورت

اور شکل میں یہ فرق ہے کہ صورت کا لفظ

ذوی الحیات کے اجسام کے لئے اور شکل کا لفظ

غیر ذی روح اشیاء کی ہیئت خارجی کے لئے

استعمال ہوتا ہے اور چونکہ توپیی جوہر حیات

سے معرئی ہے لہذا واجب آیا کہ ہم توپیی کی

شکل کہیں نہ کہ توپیی کی صورت۔ (پھر دروازہ

کی طرف پھر کر) اے جاہل مطلق شخص! یاد

رکھو کہ تجھے یہ لفظ استعمال کرنا چاہئے تھا۔

یہ لفظ۔ یہ خود ارسطاطالیس کے الفاظ ہیں۔

ارسطاطالیس کے، تو اگر چاہے تو میں اس کی

تصنیف کمبیر ”المقالات فی الصفات الاشیاء“

میں بعینہ یہی الفاظ بتلا سکتا ہوں —

مرزا نوشہ: (الگ ہٹ کر) میں تو سمجھا تھا کہ دنیا

پر کوئی آفت ناگہانی آگئی لیکن اب معلوم

ہوا کہ صرف صورت اور شکل کی بحث ہے۔

لاحول ولا قوۃ (فلسفی سے) حضور اب اس

قضیہ نا مرضیہ کو اپنے ذہن مبارک سے نکال

دالیں.....

فلسفی: مرزا صاحب اس وقت میں فرط غضب سے
 لرزہ بر اندام ہو رہا ہوں، میں خرد نہیں جانتا
 کہ میں اس وقت کس دنیا میں ہوں، اور کیا
 کر رہا ہوں —

مرزا فرشتہ: اگر حضور صورت اور توہی دوزوں سے
 تھوڑی دیر کے لئے دست بردار ہو جائیں تو
 کچھ عرض کروں —

فلسفی: (دروازہ کو دیکھتے ہوئے) گستاخ بے ادب۔
 مرزا فرشتہ: حضور آب جانے دیں، میں یہ کہنے کے لئے
 فلسفی: (اسی طرح) جاہل، اجہل،
 مرزا فرشتہ: اللہ مولوی صاحب میری طرف

فلسفی: مرد درد، اسے قضیہ مہملہ پر مصر ہوتا ہے —
 مرزا فرشتہ: اجی کوئی جاہل تھا، آپ جانے دیجئے —
 فلسفی: خود ارسطو تا ایس اس کی تکذیب کر چکا ہے —
 مرزا فرشتہ: بالکل بجا ارشاد ہوا، میں اس لئے حاضر
 ہوا تھا.....

فلسفی: اور پھر اپنی غلطی کے لئے اتنا طومار
 طویل الذیل —

مرزا فرشتہ: جناب کا خیال بالکل صحیح ہے۔ (اس دروازے
 کے پاس جا کر جس کی طرف دیکھ کر فلسفی
 بگڑ رہا تھا) —

تم بے شک بیوقوف ہو اور جاہل ہو اور اتنے گستاخ
 کہ ایک پزیرے لکھے حکیم سے بحث کرتے ہو —

(فلسفی کے پاس جا کر) حضور اب یہ معاملہ ختم ہو گیا اور اب ذرا میری عرض سن لیجئے۔ میں کمال پریشانی کے عالم میں جناب سے مشورہ کرنے کے لئے حاضر ہوا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ انصرام امور خانہ داری کے لئے ایک خاتون کے ساتھ نکاح کروں، یہ خاتون ماشاء اللہ حسن اور صحیح الجثہ واقع ہوئی ہیں، میں اُن پر مائل بھی ہوں اور وہ بھی اس رشتہ سے خرس ہیں۔ ان کے والد بزرگوار بھی اس تجویز سے متفق ہیں۔ لیکن.... خاں سار کو.... کسی قدر جگ ہنسائی کا خوف ہے، آپ تو واقف ہیں ایسی عورتوں کے شوہروں پر ہنستے سب ہیں، لیکن کوئی ان کی حالت پر رحم نہیں کرتا۔ حضور خدا کے فضل سے حکیم ہیں، دانا ہیں، اس لئے جناب کے مشورہ کی ضرورت ہے، فلسفی:

(درازے کی طرف گھور کر) میں خلا کے امکان کو چاہے مان لوں، چاہے یہ بھی تسلیم کر لوں کہ میں خرد نامشخص ہوں، لیکن حاشا وکلا کہ میں توپی کے لئے ضرورت کے لفظ کو ہرگز ہرگز روا نہیں رکھ سکتا۔

مرزا نوشہ: الگ ہمت کر) اس شخص سے خدا سمجھے۔ (فلسفی سے) مولانا۔ خدا کے لئے کسی غریب کی بات تو سن لیا کیجئے۔ میں ایک گھنٹہ سے جناب کو متوجہ کر رہا ہوں، لیکن آپ ہیں کہ جواب ہی نہیں دیتے۔

فلسفی: معاف کیجئے گا، مرزا صاحب، لیکن میرا اس

وقت کا غیظ و غضب کچھ بے محل نہیں۔

مرزا نوشہ: خیر، اب اس غصہ کو دور فرمائیے اور اللہ

تکلیف کر کے میری طرف متوجہ ہو جائیے۔

فلسفی: بطیب خاطر! میں ہمہ تن گوش ہوں، تصدیقہ فرمائیے۔

(دونوں بیٹھ جاتے ہیں۔ مرزا فلسفی کے سیدھے ہاتھ

کی طرف بیٹھا ہے)

مرزا نوشہ: میں جناب سے ایک خاص مسئلہ کے متعلق گفتگو

کرنا چاہتا تھا۔

فلسفی: تو جناب کس زبان سے کام لیں گے۔

مرزا نوشہ: زبان؟

فلسفی: جی ہاں۔

مرزا نوشہ: قبلہ میں اسی زبان سے گفتگو کروں گا جو

میرے منہ میں ہے۔ کسی پڑوسی کی زبان تو

میں مستعار لینے سے رہا۔

فلسفی: میرا امر مستفسرہ یہ تھا کہ السنہ قدیمہ

و جدیدہ میں سے آپ اظہار خیال کے لئے کس

کو منتخب کریں گے۔

مرزا نوشہ: اچھا، میں اب سمجھا۔

فلسفی: کیا جناب زبان عربی میں مکالمہ کریں گے۔

مرزا نوشہ: جی نہیں۔

فلسفی: عبرانی زبان میں۔

مرزا نوشہ: نہیں صاحب۔

فلسفی: سریانی میں۔

مرزا نوشہ: توبہ کیجئے حضرت، میں سریانی کیا جافوں۔

فلسفی: کلدانی، ترکی، سامی، چینی، الہانی، انگریزی، فارسی، آخر ان میں سے کوئی زبان تو استعمال فرمائیے گا۔

مرزا نوشہ: (جزبہ ہو کر) نہیں، صاحب، نہیں، نہیں، نہیں، خاکسار صرف اُردو زبان میں گفتگو کرے گا۔

فلسفی: (نفرت سے مرزا کو دیکھ کر) اُردو زبان میں!

مرزا نوشہ: جی ہاں عرض تو کر رہا ہوں۔

فلسفی: تو ازراہ عطوفت یہیں سے اُٹھ کر یسار کی

طرت تکلیف فرمائیے۔ عاصی کادایاں کان صرف

السنہ غیر بولنے والے حضرات فضلا و علماء

کی نغز گفتاری کے لئے مخصوص ہے آپ ایسے

مادری زبان بولنے والے جہلا کے لئے خاکسار

کا یہ کان (بائیں کان کی طرف اشارہ کر کے)

مخصوص ہے (مرزا کو داہنی طرف سے اُٹھا کر

بائیں طرف بٹھا دیتا ہے)

مرزا نوشہ: حضرت مولانا! بندے کا ارادہ ایک نوجوان

حسینہ کے ساتھ شادی کرنے کا ہے، مجھے اُن سے

بہت محبت ہے اور ان کے والد بزرگوار بھی

اس رشتہ سے راضی ہیں، لیکن مجھے ایک امر

کا خدشہ ہے اور وہ یہ کہ.....

فلسفی: (مرزا کی طرف متوجہ نہیں ہے) نطقِ ترجمانی

و توسیل خیالات کے لئے ودیعت کیا گیا ہے، جس طرح تصورات اشیاء کے نہایندے ہوتے ہیں، اسی طرح الفاظ تصورات کی ترجمانی کرتے ہیں (مرزا غصہ سے فلسفی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ ہاتھ ہٹاتے ہی فلسفی پھر وہی سلسلہ شروع کر دیتا ہے، یہ کئی مرتبہ ہوتا ہے) لیکن ان نہایندوں اور دوسرے نہایندوں میں تماین ہے، بدیں وجہ کہ نہایندے مشخص ہوتے ہیں اپنے اپنے اصل سے۔ درآئندہ لیکہ شق ثانی اپنے اصل پر بالذات حاوی ہے، وہ بالاصل تصور ہے جس کی توضیح علامت خارجی سے ہوتی ہے، یہ مبرہن ہے من یحسن الفکر، یحسن القول، اندریں خصوص جناب اس بندۂ عاصی پر اپنے تصورات عالیہ کا اظہار علامات سریع الفہم سے فرمائیں۔ (مرزا فلسفی کو دروازے کے اندر دھکا دے کر باہر سے دروازہ بند کر لیتا ہے)

فلسفی: (اندر سے) اللسان ترجمان القلب، (کھڑکی کے اوپر چڑھ کر اور گردن باہر نکال کر کہتا ہے) زبان ہی ایک ایسا آئینہ ہے جو ہماری انفرادیت کے حقایق کو منعکس کرتا ہے، پس چونکہ تم صفت استدلال سے متصف اور حیوان ناطق واقع ہوئے ہو، فلہذا کلمہ کا استعمال

کر کے کیوں اپنے منشاء مافی الضمیر کو ظاہر نہیں کرتے—

مرزا نوشہ: میں بھی تو کر رہا تھا لیکن آپ میری سنتے ہی نہیں—

فاسفی: نہیں اب میں مخاطب ہوں، آپ فرمائیں—

مرزا نوشہ: مولانا بات یہ ہے کہ—

فاسفی: لیکن طراوت گفتار سے احتراز واجب ہے—

مرزا نوشہ: ایسا ہی ہو گا—

فاسفی: خراہ منشاء اطناب کلام سے کام نہ لیا جائے—

مرزا نوشہ: خدا کے لئے مولانا.....

فاسفی: اختصار کلام سے کام لے کر اپنی مکالمات کو

”المبصر فی الکوزۃ“ کا مصداق بنائے—

مرزا نوشہ: میں عرض تو کر چکا ہوں.....

فاسفی: بے محل تشریح و توضیح سخن الفاظ

و استعارات و تمثیلات کی تکلیف دہ

ژولیدگی سے پرہیز کرنا چاہئے—

(مرزا عاجز ہو کر فاسفی کو مارنے کے لئے پتھر

اُٹھا تا ہے—

فاسفی: یہ کیا حرکت مذمومہ ہے بجائے اظہار خیالات

کے تم مغلوب الغضب کیوں ہوئے جاتے ہو

(دروازہ کی طرف اشارہ کر کے) بس صاحب

آپ بھی سیدھی طرح تشریف لے جائیے۔ آپ تو

اس نامعقول سے بھی زیادہ دریدہ دہ

و بد اگام ہیں ، جس نے توپی کے لئے صورت کا لفظ استعمال کیا تھا (فیچے آجاتا ہے) میں ہر وقت ، ہمیشہ ، اور ہر مقام پر دلائل ساطعہ و براہین قاطعہ سے ، برہانات لمبی و انی سے تم پر یہ امر ثابت کر سکتا ہوں کہ تم حیوان مطلق ہو ، اور ہمیشہ حیوان مطلق رہو گے اور میں ، علامہ خجندی ہوں ، اور ابد الابد تک یہی رہوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہوا المستعان۔

مرزا نوشہ : (غصہ سے) کیا بکی شخص ہے —

فاسفی : میں تم پر ثابت کر دوں گا کہ میں عالم اور ادیب ہوں —

مرزا نوشہ : (طاف سے) ابوی ! ساساہ ختم نہیں ہوا —

فاسفی : میں صاحب فضل و صاحب ذوق ہوں (دروازہ کی طرف جاتا ہے) علوم طبیعی و اخلاقی و سیاسی میں کامل دستگاہ رکھتا ہوں۔ (واپس آتا ہے) بہ ہر اسلوب و بہ ہر نہج ، مولانا ، بالفضل والعلم رلادب اولانا و افضل ہوں (جاتا ہے) ہر عام میں بالتمذیل دستگاہ تمام رکھتا ہوں۔ (آتا ہے) اساطیر اولیہ ، صنہیات ، تاریخ صرت و نعو ، بیان ، معانی ، کلام۔ (جاتا ہے) ریاضی ، حساب ، مناظریات ، طبیعیات ، مابعدالطبیعیات ، (آتا ہے) عالمیات ، ہندسہ ، تعمیرات ، فنون عقلیہ (جاتا ہے) طب ، فلکیات

نجوم - علم قیافہ ' رمل ---

(فاسفی چلا جاتا ہے اور مرزا اکیلا رہ جاتا ہے)

خدا ان عالموں سے سمجھے جو کسی کی بات سنتے ہی نہیں۔ یہ جو میں سنا کرتا تھا کہ ان بزرگوں کے معلم اور حضرت ارسطو طالیس محض بکی تھے یہ واقعی صحیح ثابت ہوا۔ خیر، اب دوسرے حضرت کی زیارت کرنی چاہئے۔ شاید وہ ان مولانا سے زیادہ سنجیدہ اور معقول ہوں اب وہیں جاتا ہوں۔

(جاتا ہے)

————— : 0 : —————

تیسرا سین - حکیم چلمپی دوسرے فلاسفر کا مکان -

(مرزا داخل ہوتا ہے، حکیم صاحب مطالعہ میں مصروف ہیں)

چلمپی : (مرزا کو آتا دیکھ کر اس سے مخاطب ہوتے ہیں) آئیے مرزا صاحب، کہئے کیسے آنا ہوا۔
مرزا نوشہ : مولانا مجھے ایک خاص معاملہ میں آپ سے مشورہ کی ضرورت ہے۔ اسی لئے حاضر ہوا ہوں۔
(الگ) یہ تو مرد معقول نظر آتا ہے۔ دوسروں کی سنتا تو ہے)

چلپی: (متانت سے) آپ شوق سے اپنے منشاء کا اظہار کیجئے، لیکن براہ کرم اس طرز گفتگو کو ذرا بدل دیجئے تو اچھا ہے۔ ہمارے فاسفہ میں لکھا ہوا ہے کہ کبھی کوئی قضیہ ایجابی اور قطعی بنا کر پیش نہ کرنا چاہئے بلکہ ہمیشہ احتمالات سے بحث کی جائے اور قطعی حکم سے اجتناب کیا جائے۔ پس آپ کو یہ نہ کہنا چاہئے کہ میں حاضر ہوا ہوں، بلکہ یوں فرمائیے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں حاضر ہوا ہوں۔

مرزا نوشہ: معلوم ہوتا ہے؟

چلپی: جی ہاں!

مرزا نوشہ: یا مظهر العجائب! حضرت معلوم تو آپ سے آپ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ واقعہ ہے۔

چلپی: یہ استدناج صحیح نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہو، لیکن واقعہ نہ ہو۔

مرزا نوشہ: قبلہ۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ میں اس وقت جناب کے روبرو حاضر ہوں۔

چلپی: یہ امر متنازعہ فیہ ہے اور ہم کو ہر قضیہ کو مشکوک سمجھنا چاہئے۔

مرزا نوشہ: (بگڑ کر) کیا فرمایا؟ کیوں صاحب کیا میں اس وقت یہاں موجود نہیں ہوں، اور کیا آپ مجھ سے مخاطب نہیں ہو رہے ہیں۔

چلپی : (اسی متناسق کے ساتھ) بظاہر آثار آپ میرے

سامنے ہیں، اور بظاہر آثار میں آپ سے مخاطب ہوں، لیکن ایسا ہونا قطعی نہیں ہے۔

مرزا نوشہ : عاجز ہو کر) لاحول ولا قوت، مولانا۔ آپ ضرور

مذاق فرما رہے ہیں، میں یہاں کھڑا ہوا ہوں

آپ وہاں تشریف رکھتے ہیں، یہ تو صاف

واقعہ ہے۔ اس میں بظاہر آثار کا دم چھلا

کہاں سے آگیا (ہاتھ جوڑ کر) للہ ان موشکافیوں

اور نکتہ آفرینیوں کو ذرا دیر کے لئے چھوڑ

د بیٹے اور میرا معاملہ سماعت فرمالیجئے۔

میں آپ سے یہ عرض کرنے حاضر ہوا تھا کہ میں

چاہتا ہوں کہ اپنی شادی کر لوں۔

چلپی : بندہ اس سے لاعلم محض ہے۔

مرزا نوشہ : لیکن میں جو عرض کرتا ہوں!

چلپی : ممکن ہے کہ یہی ہو۔

مرزا نوشہ : میں جس درشہزادے سے شادی کرنا چاہتا ہوں

وہ فوجوان اور حسین ہے۔

چلپی : ایسا ہونا نا ممکن نہیں ہے۔

مرزا نوشہ : اب فرمائیے کہ میرا اس کے ساتھ شادی کرنا

اچھا ہوگا یا برا۔

چلپی : انہی دو صورتوں میں سے ایک۔

مرزا نوشہ : (الگ) اللہ رحم کرے، یہ بزرگ تو دوسری

ہی رائی سنا رہے ہیں (فلسفی سے) مولانا۔

میں آپ سے یہ دریافت کر رہا ہوں کہ دوشیزہ

مذکورہ سے نکاح کرنا اچھا ہو گا یا برا —

چلپی: یہ اتفاقات پر منحصر ہے —

مرزا نوشہ: کیا برا ہو گا —

چلپی: جیسی صورت ہو —

مرزا نوشہ: اللہ تھیک تھیک جواب تو دیدیا کیجے —

چلپی: بندے کی نیت بھی یہی ہے —

مرزا نوشہ: مجھے یہ لڑکی بہت پسند ہے —

چلپی: ہاں یہ ممکن ہے —

مرزا نوشہ: اس کا باپ بھی راضی ہے —

چلپی: اس کے راضی ہونے کا بھی امکان ہو سکتا ہے —

مرزا نوشہ: لیکن مجھے تو ہے کہ کہیں شادی کرنے کے بعد

مجھے دھوکہ نہ ہو —

چلپی: یہ چیز بھی محتاح نہیں ہے

مرزا نوشہ: تو پھر جناب کا کیا خیال ہے —

چلپی: (تیوری دیر سوچ کر) اس میں کوئی چیز

نا ممکن تو نہیں معلوم ہوتی —

مرزا نوشہ: اچھا اگر خود آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے۔

چلپی: بندہ کچھ نہیں جانتا —

مرزا نوشہ: آپ مجھے کیا کرنے کی صلاح دیتے ہیں —

چلپی: جو آپ کی مرضی ہو —

مرزا نوشہ: والدہ! میں پاگل ہوا جاتا ہوں —

چلپی: تو بندہ اس معاملہ ہی سے ادبِ داستاں

ہوا جاتا ہے —

مرزا نوشہ: (زور سے) خدا اِن عقلی اُدھیڑ بن میں پڑنے والوں کو غارت کرے —

چلپی: ایسا ہونا بھی مہکنا سے ہے —

مرزا نوشہ: (الگ) رہ تو جا بد معاش، دیکھ تو تجھے کیسا تھیک بناتا ہوں، تمہاری یہ راگنی نہ بدلوا دوں تو نام بدل دالوں۔ چلے ہیں وہاں سے فلسفی بن کے، پاڈل کہیں کا چلپی کو مارتا ہے (چلپی: ہائیں۔ ہائیں۔ ارے۔ ارے یہ کیا ہو رہا ہے۔

مرزا نوشہ: یہ تمہاری ہرزہ سرائی کی سزا ہے (سانس لے کر) افو، اب میرے دل کی بھڑاس نکلی۔ چلپی: (نہایت غصہ سے) کیوں جی، یہ کیا بے تمیزی تھی۔ تم نے اس طرح سے میری اہانت کی، تم اور مجھ جیسے حکیم پر ہاتھ اُٹھاؤ!

مرزا نوشہ: (جھک کر تعظیم بجا لاکر) مولانا، اس طرز گفتگو کو بدل دیجے تو اچھا ہے، ہر قضیہ کو مشکوک سمجھنا چاہئے۔ آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ ”تم نے مجھ پر ہاتھ اُٹھایا“ آپ کو یہ کہنا چاہئے کہ ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے مجھے مارا“ —

چلپی: بیہودہ، بے ادب افسان، میں اس زد و کوب

کی شکایت منصف صاحب تک لے جاؤں گا —

مرزا نوشہ: (کھال متافت سے) میں اس معاملہ

دست بردار ہوا جاتا ہوں۔۔

چلپی : میرے جسم پر ضرب کے نشانات موجود ہیں۔

مرزا فوشہ : ایسا ہونا ممکن ہے۔

چلپی : یہ تو تم خود جانتے ہو کہ یہ تمہاری ہی

حرکت ہے۔

مرزا فوشہ : یہ بھی ناممکن نہیں ہے۔

چلپی (غصہ سے) میں تمہارے نام وارنٹ جاری

کراؤں گا۔ وارنٹ۔

مرزا فوشہ : بندہ اس سے لاعلم معص ہے۔

چلپی : اور تم کو سزا دلوں گا۔

مرزا فوشہ : یہ بھی ممکن نہیں ہے۔

چلپی : دیکھنا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ (چلا جاتا ہے)

مرزا بھی چلا جاتا ہے۔

————— : 0 : —————

چوتھا سین۔ راستہ

مرزا فوشہ : (اکیلا۔ رومال سے پسینہ صاف کر کے) اب کیا

کیا جائے۔ اس مردود شخص سے تو ایک حرف

بھی مشورہ کا نہ مل سکا اور بندہ جیسا آیا تھا

ویسا ہی جاتا ہے، شادی کا انجام اتنا مشتبه ہے

کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ مجھ سے

زیادہ پریشان کبھی کوئی بھلا آدمی کا ہے کو
ہوا ہوگا۔

(راستہ کی طرف دیکھ کر) - آخہ جوتشی جی پدھار
رہے ہیں، شاید ان سے قسمت کا حال معلوم ہو۔

جوتشی جی : (فال کھولیں، رسل نکالیں)
مرزا نوشہ : (آگے بڑھ کر) پالاگوں مہاراج ! ذرا ہمارے
کرم کا لیکھا بھی بتلا دیجے۔

جوتشی جی : دھن ہو مہاراج، جے ہوگی، (زمین پر پوتھی
کھول کر بیٹھ جاتے ہیں) لاؤ مہاراج سیدھا
ہستہ پساو۔ بدھی پہلے دیوتاؤں کی پرشاد
کے روپیہ دلاؤ۔

مرزا نوشہ : (زمین پر بیٹھ کر) او مہاراج یہ روپیہ لو
اور میرا کرم بانچ دو۔

جوتشی جی : مرزا کے دائیں ہاتھ پر ہاتھ پھیر کر) نم
نم، نم منم سواھا، مہاراج تمہارا فچھتر اتر
کھا دے۔ بیبا گھات جوگ گفتالیس کھڑی
تیرہ پل پر ہے چندر مان کنیا راس میں براج
رہے ہیں۔ ۱۱ ویں کنگلی میں برہسپت اور
کیت کا میل ہو رہا ہے، لگن کے لئے یہ کھڑی
سبھہ لکھتا ہے۔ لو سنو مہاراج، تمہارا بواہ
جس کنیا سے ہوگا وہ بڑی سندر ہوگی، اس
کی سیوا کے لئے نگری کے انوپ مافش تمہاری
حویلی پر آئیں گے، اسی کے کارن سنسار میں

تمہارا مان ہوگا۔

سرزا نوشہ: جوتشی جی، یہ سب کچھ صحیح، لیکن تم مجھے اتنا بتا دو کہ یہ کنیا ست وقتی ہوگی یا نہیں مجھے دھوکا تو نہ ہوگا۔

پندت: (پوتھی لپیت کر کھڑے ہو جاتے ہیں) دھوکا

کنیا ستونتی ہوگی یا نہیں! رام رام کرو
سہاراج رام رام کرو (چلا جاتا ہے)

سرزا نوشہ (اکیلا) خدا اس جوتشی سے سمجھ، یہ بھی مجھے جیسے کا ویسا چھوڑ گیا (غصہ سے) کچھ نہیں صاحب، مجھے اس شادی کا انجام ضرور معلوم ہونا چاہئے، اب میں کیا کروں، خوب یاد آیا پیر نبی بخش جی عامل کے پاس جاتا ہوں ان کے عمل کا بڑا چرچا ہے۔ ان سے پوری پوری حقیقت معلوم ہوگی۔ (اتنے میں شکیلہ کا نوکر خط لئے ہوئے گاتا ہوا آتا ہے) اچھا اب شاید حقوق طلبی کا دوسرا پرانہ آیا ہے (نوکر سے) کیا ہے جی؟ چونک کر اور خط چھپانے کی کوشش کر کے)

لڑکا: جی کچھ نہیں چھوٹی بیوی کا خط لیکر سرزا فہیم کے پاس جا رہا ہوں۔

سرزا نوشہ: سرزا فہیم کے پاس! میں یہ خط ضرور پڑھوں گا، (لڑکے سے) لایہ مجھے دیدے میں سرزا فہیم کو دے دوں گا، تو کہاں جائے گا، یہ لے

چوئی ، مٹھاٹی کہا لیٹا —

(لو کا سلام کر کے رخصت ہوتا ہے۔ مرزا خط پڑھتے ہیں)

”فہیم صاحب ، تسلیم ، آپ کا خط ملا۔ آپ بھی کتنے جلد متاثر ہو جاتے ہیں ، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مرزا فرسہ سے شادی کر کے میں بدل جاؤں گی ، یا آپ کا خیال میرے دل سے نکلی جائے گا آپ اتنا نہیں سمجھتے کہ اس پورے کی عمر اب کتنے دن کئی اور ہے ، چراغ سحری ہو رہا ہے ، اس کے مرنے کے بعد کوئی کانتا نہ رہے گا ، سردست روپیہ حاصل کرنے کی تدبیر ضروری ہے ، امید ہے کہ آپ اپنے دل کو سمجھا لیں گے ، خدا حافظ“

مرزا خط پڑھ کر غصہ سے پہاڑ تالتا ہے ”حد ہو گئی سر سے پانی اونچا ہو گیا اب تو مجھے ان نیک بخت سے پیچھا چھڑانا ہی پڑا۔ لادول ولا قوت ، تھوڑا روپیہ خواہ مخواہ خرچ ہو گیا ، لیکن اگر یہ نسبت ثبوت جائے تو میں روپیہ سے بھی صبر کر لوں اور سمجھوں کہ بھر پایا۔ میں مرزا عسکری کے پاس جا کر تصفیہ ہی کئے لیتا ہوں —

(جاتا ہے)

پانچواں سین - مرزا عسکری کا مکان - عسکری بیٹھا ہوا
ہے، 'حقہ پی رہا ہے

(مرزا آتا ہے) 'آخا،' میاں نوشہ - آؤ بھائی کہو کیسے آئے۔

مرزا: آداب عرض کرتا ہوں۔

عسکری: جیتے رہو، کہو کچھ کہنا ہے۔

مرزا: (تامل سے) قبلہ - کیا عرض کروں، بات یہ ہے

کہ بندے نے آپ سے درخواست کی اور آپ نے

مجھے اپنی غلامی میں لینا منظور بھی فرمایا،

لیکن اب مجھے خیال آ رہا ہے کہ میں ضعیف

ہو گیا ہوں اور آپ کی صاحبزادی کے لئے

موزوں نہیں ہوں۔

عسکری: کیا باتیں کرتے ہو، میاں بچی تو تم سے خواہی

ہے اسے تمہاری عمر کا کوئی خیال بھی نہیں

ہے، 'انشاء اللہ' اچھی طرح بسر کر لے جائے گی۔

مرزا: بجا ارشاد ہوا، لیکن قبلہ، خاکسار کا مزاج

بہت وہمی واقع ہوا ہے۔ بعض اوقات جنون

کے دورے بھی اُٹھتے ہیں، وہ غریب اس کی

قاب کیوں کر لائے گی۔

عسکری: نہیں بھائی، میری لڑکی ماشاء اللہ بہت سنجیدہ

و فہمیدہ ہے، وہ ضرور نبھائے جائے گی۔

مرزا: جناب والا، بندہ کچھ عوارض جسمانی میں بھی مبتلا ہے۔

عسکری: خیر کیا ہوا، صحت بیماری مقدر کی بات ہے۔
فیک بیویاں اپنے شوہروں کی بیماری کی وجہ سے اُن سے نفرت تو نہیں کرتیں۔

مرزا: پھر تو صحت صحت عرض کرنا پڑے گا، میرا مشورہ جناب کو یہ ہے کہ انہیں میرے عقد میں نہ دیں۔

عسکری: (غصہ سے) میان مجھ سے مذاق کرتے ہو، میں مرتے مرتے میرجاؤں گا، لیکن وعدہ خلائی نہ کروں گا۔

مرزا: حضرت میں اس وعدہ سے جناب کو سبکدوش کئے دیتا ہوں۔

عسکری: ناممکن ہے، میں تم کو قول دے چکا ہوں اور اگرچہ اس کے رشتہ کے اور لوگ بھی متمنی ہیں، لیکن وہ تمہیں کر دی جائے گی۔

مرزا: (الگ) جی ہاں، میں قبول کئے ہی تو لیتا ہوں۔

عسکری: میان بات یہ ہے کہ مجھے تمہارا خاص طور پر خیال ہے، اور تم مجھے بہت پسند ہو، تمہاری خاطر تو میں اسے شاہزادی کر بھی نہ دوں، کبھی نہ دوں۔

مرزا: خیر یہ حضور کی ذرہ فوازی ہے، لیکن جناب میں قطعی تصفیہ کر چکا ہوں کہ ہرگز شادی

نہ کروں گا۔

عسکری: کیا کہا، کبھی شادی نہ کروں گا۔

مرزا: جی ہاں۔

عسکری: آخر وجہ، سبب؟

مرزا: اس لئے کہ میں اپنے آپ کو شادی کے قابل نہیں

سمجھتا، اور کیا سبب ہو سکتا ہے؟ دوسری

بات یہ ہے کہ میں اپنے والد مرحوم اور دوسرے

بزرگوں کا اتباع کرنا چاہتا ہوں، یہ سب

حضرات ہمیشہ اپنی شادیوں کے مخالف رہے۔

اور کبھی اس پر راضی نہ ہوئے۔

عسکری: اچھا تو سنو، اپنی اپنی پسند ہے،

میں تم کو مجبور نہ کرنا نہیں کرتا۔ تم نے شادی

کا وعدہ کر لیا تھا، اس لئے میں نے جملہ سامان

مکمل کر لیا تھا، اب تم اس سے کنارہ کش ہو

رہے ہو، تو خیر، میں زمانے میں جا کر تصفیہ

کئے لیتا ہوں اور تم کو ابھی نتیجہ معلوم

ہو جائے گا۔ (جاتا ہے)

مرزا: (اطمینان کی سانس لے کر) شکر ہے کہ یہ

بزرگ امید سے زیادہ سمجھدار نکلے، میں تو

سمجھتا تھا کہ پیچھا چھڑانا دشوار ہو جائیگا۔

والہ! جب میں غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا

ہے کہ میرا کنارہ کش ہونا اچھا ہی ہوا، اگر

میں یہ حرکت کر گدرتا تو عمر بھر پچھتاؤنا

پرتا۔ (راستہ کی طرف دیکھ کر) اچھا صاحب

زادے صاحب جراب لے کر آ رہے ہیں۔

(مرزا صہمام بڑے کروفر سے داخل ہوتے ہیں ہاتھ

میں ایک چھڑی اور دو تلواریں ہیں بہت نرمی سے کہتے ہیں)

مرزا صاحب خادم کی تسلیم قبول ہو۔

مرزا: (مرزا اُتھ کر اور سلام کرے) آداب پھر

کرتا ہوں۔

صہمام: حضرت قبلہ گاہی سے ابھی ابھی معلوم ہوا کہ

جناب نے میری خواہر کے ساتھ نکاح (رک رک

کر) کرنے کا جو وعدہ کیا تھا اس سے اب کنارہ

کش ہو رہے ہیں۔

مرزا: بجا ارشاد ہوا، کیا عرض کروں، کہاں افسر

ہوا لیکن.....

صہمام: معذرت کی کیا ضرورت ہے۔ اس میں ہرج ہی

کیا ہوا۔

مرزا: جی نہیں، میں صحیح عرض کرتا ہوں کہ مجھے

یہ انتہا قلق ہوا، میری خواہش تو یہ

تھی کہ.....

صہمام: نہیں صاحب یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے، (دو

تلواریں پیش کرتا ہے) مہربانی کر کے ان میں

سے ایک تلوار پسند فرمالیجئے۔

مرزا: (حیرت سے اس کا منہ دیکھ کر) ایک تلوار

پسند کر لیں؟

صہمام: (متانت کے ساتھ) جی ہاں! عنایت ہوگی۔
مرزا: آخر کیوں؟

صہمام: جی کچھ نہیں، آپ نے وعدے کے باوجود میری خواہر کے ساتھ عقد کرنے سے انکار کیا اور اب مجھے امید ہے کہ جناب اس حقیر ہدیہ کو قبول فرمائیں گے۔

مرزا: میں سمجھا نہیں؟
صہمام: اگر کوئی اور ہوتا، تو خواہ مخواہ شور و غوغا مچاتا، آپ پر غصہ ہوتا، لیکن (مونچھوں پر تاؤ دے کر) ہمارا فرقہ ہر کارروائی نہایت اطمینان کے ساتھ کرتا ہے اور میں اس وقت آپ سے بہ ادب یہ درخواست کرنے حاضر ہوا ہوں کہ اگر جناب کی رائے ہو تو ہم لوگ ایک دوسرے کو قتل کرنے کی کوشش کریں۔

مرزا: یہ عجیب طرح کا ہدیہ ہے۔
صہمام: جلدی کیجئے صاحب (تلوار بڑھا کر) ایک تلوار اٹھا لیجئے۔

مرزا: (تڑکڑکتے ہوئے) ویسے تو میں آپ کا ادنیٰ خادم ہوں لیکن سردست مجبور ہوں اس لئے کہ مشق قتل کے قابل کوئی سر میرے پاس نہیں ہے۔

(الگ) اس کے تیور تو بڑے بیادہب نظر آتے ہیں۔

صمصام: جناب منی، معاف فرمائیں گے، لیکن جو میں عرض کر چکا ہوں، وہ ہو گا ضرور،

مرزا: (قصہ سے) حضرت ایسی پیشکش پر تین حرفت۔

صمصام: ہم لوگ ذرا عجلت سے کام لیں تو مناسب ہوگا بندے کو مشاعرہ میں جانا ہے۔

مرزا: جناب میں صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ اس وقت مجھے اس کام کی مطلق خواہش نہیں ہے۔

صمصام: تو کیا آپ جنگ نہ فرمائیں گے؟

مرزا: والدہ نہیں، ہرگز نہیں۔

صمصام: کیا آپ تصفیہ کر چکے ہیں۔

مرزا: جی ہاں۔

صمصام: (مرزا کو بید سے سارنا ہے) پھر بہت ملائمت سے کہتا ہے) تو اب کم از کم جناب کو شکایت کا

تو کوئی موقع نہ ہوگا، آپ خود واقف ہیں کہ میں کس قدر باضابطہ کارروائی کر رہا ہوں، آپ نے وعدہ خلافت کی، میں نے آپ سے

جنگ کرنی چاہی، آپ نے انکار کیا، میں نے آپ کو زد و کوب کی۔ یہ تمام کارروائی بالکل

ضابطہ کے مطابق ہوئی ہے۔ آپ شریف آدمی ہیں اور امید ہے کہ میرے طرز عمل پر آپ

کو اعتراض نہ ہوگا۔

مرزا: (الگ) (یہ تو بڑا بکا رنگلا)۔

صمصام: (پھر تلواریں پیش کر کے) آئیے صاحب، شرفا کی

طرح کام کیجئے ، ورنہ مجھے مجبوراً گوشہ اہی
کوئی پڑے گی۔

مرزا: کیا آپ لڑنے پر تیلے ہی ہرے ہیں۔

صہبام: جناب ، بندہ کبھی کسی کو مجبور نہیں کرتا ، یا

تو آپ مجھے سے جنگ فرمائیے یا میری
خواہ کے ساتھ نکاح کیجئے۔

مرزا: حضرت افسوس ہے کہ ان درفوں صورتوں

میں سے کوئی بھی منظر نہیں ہے۔

صہبام: واقعی !

مرزا: واقعی۔

صہبام: اچھا تو پھر اجازت ہے نہ (مارتا ہے)

مرزا: ارے ارے یہ کیا ہو رہا ہے۔

صہبام: جناب مجھے بے انتہا ملال اس بات کا ہے کہ مجھے

آپ کے ساتھ یہ سلوک کرنا پڑتا ہے لیکن بہ

ادب اتنا عرض کرتا ہوں کہ جب تک آپ

میری ہمشیرہ کے ساتھ نکاح کا وعدہ نہ

فرمائیں میں ہاتھ نہیں روک سکتا۔ (چھڑی

اٹھاتا ہے)۔

مرزا: (لجاجت سے) اچھا بھائی معاف کرو ، میں

شادی کروں گا ، کروں گا۔

صہبام: سہربان من ، مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ کے

حراس برج ہو گئے ، اور اب معاملہ صاف ہے۔

میں بہ حلیف عرض کرتا ہوں کہ میں دنیا میں

سب سے زیادہ آپ کی عزت کرتا ہوں اور اگر
 آپ مجھے بدسلوکی پر مجبور کرتے تو مجھے بے
 انتہا ملال ہوتا۔ تو میں اب قبلہ گاہی کو بلائے
 لاتا ہوں اور انہیں تصفیہ کی اطلاع دئے
 دیتا ہوں (درد آڑے کے پاس جا کر کہتا ہے)
 ابا جان، مرزا فوشہ اب معقولیت کے ساتھ
 گفتگو کرنے پر آمادہ ہیں۔ انہوں نے نیت کراہی
 ہے کہ اب ہر کام بطریق احسن کروں گا۔ اب
 آپ خواہر دو اُن کے نکاح میں دے سکتے ہیں۔
 سوزا عسکری: (باہر آکر) میاں! قاضی صاحب موجود ہیں۔
 تم کو صرف قبلت کہنے کی زحمت ہوگئی۔
 خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس بلا سے نجات مل گئی۔ اب اس
 کی حفاظت کرنا تمہارا فرض ہے، آؤ۔ اب اس کار خیر سے
 فراغت کر لیں اور خدا کا شکر بجالائیں۔

درواپ سین



اخبار علمیدہ

ریڈیو (Radio) کی حیرت انگیز ایجادوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے، چنانچہ Broad casting (اشاعت اصوات) کے لئے خرد ہمارے ہندوستان میں کلب قائم ہو چکے ہیں اور شوقین لوگ ان میں جا کر لندن کے مشہور کلاؤنتوں کے گانے سن سکتے ہیں، لیکن یورپ اور امریکہ میں اس کی منت نئی ایجادیں ہو رہی ہیں۔ آوازوں کی طرح تصویریں بھی چشم زدن میں ہزاروں کوس دور بھیجی جاسکتی ہیں، مثلاً اگر امریکہ میں ایک شخص تقریر کر رہا ہو، تو آپ ہندوستان میں اپنے گھر بیٹھے ہوئے آج ہی اس کی تقریر بھی سن سکتے ہیں اور اسے دیکھ بھی سکتے ہیں! اگر یہ ایجاد عام ہو گئی تو دلچسپی کے موقعوں پر جو جم غفیر ہوتا ہے وہ نہ ہوا کرے گا اور دنیا کے اہم واقعات مثلاً کسی مشہور مقرر کی تصویر تریبی کی دور وغیرہ ہر شخص گھر بیٹھے دیکھ سکے گا۔

دور بصری (Television) کے علاوہ ریڈیو (Radio) کی مدد سے دور نویسی بھی ممکن ہو گئی ہے، آپ ادھر

اپنے کمرے میں کسی کاغذ پر دستخط کیجئے، اُدھر چند
 منتوں میں دور سے دور مقام پر یہ دستخط پہنچ
 جائیں گے اور ایک دوسرے آلہ کی مدد سے آپ کا عکس
 بھی اسی طرح منتقل ہو سکے گا، اس ایجاد نے اگر ایک
 طرف جرائم کی تعداد میں اضافہ کا امکان پیدا کر دیا ہے
 تو دوسری طوط اسی کی مدد سے مجرموں کی گرفتاری
 کے نئے نئے طریقے نکال رہے ہیں، چنانچہ اطلاع ملی ہے کہ
 لندن کے کانستبلوں کو دیاسلائی کی تہیاء کے برابر ایک
 آلہ دیا گیا ہے، جب کہیں واردات ہو گی تو صدر دفتر سے
 اس کی اطلاع چشم زدن میں ہو چوکی پر پہنچ جائے گی
 اور اس آلہ کے ذریعہ ہر چوکی اس واردات کی پوری
 تفصیل معلوم کر سکے گی اور فوراً مستعد ہو جائے گی۔

حال ہی میں برلن میں ایک ایسا ہوائی جہاز بنایا
 گیا ہے جس کے پر حسب ضرورت کھولے اور تھکے جا سکتے
 ہیں۔ اس مشین سے معمولی موٹر کا کام بھی لیا جا سکتا ہے
 اور تھوڑی سی دیر میں حسب ضرورت یہ اُڑنے کے لئے
 بھی تیار ہو سکتی ہے یہ ”ہوائی موٹر“ عنقریب جرمنی
 کے بازاروں میں بکنا شروع ہو گی۔

انسانی قلب کی دھڑکن اس قدر خفیف ہوتی ہے کہ
 آسانی سے سنی نہیں جاسکتی، خصوصاً مرض یا چیر پھاڑ
 کی حالت میں قلب کی حرکت کا اندازہ لگانا اور بھی

دشوار ہے۔ لیکن ابھی حال میں وبسٹ منسٹر (انگلستان) میں لاسلکی (Wireless) آلات کی جو فہائش ہوئی اس میں ایک ایسا آلہ بھی رکھا گیا تھا جس کی مدد سے قلب کی حرکت کی آواز زور کی ہو جائے چنانچہ اب کئی ڈاکٹر ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے مریض کے دل کی دھڑکن کو آسانی کے ساتھ سن سکتے ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ اس ایجاد سے چیر پھار کے حادثوں میں کمی ہو جائے گی۔

زمانہ حال کی مختلف خصوصیات اور ان کے نتائج سے بحث کرتے وقت پرانے لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ آج کل آدمی کی عمر کم ہو گئی ہے، اور سائنس کی ایجادات زندگی کی بڑھی ہوئی جدوجہد، ضروریات زندگی، گرائی، افسانوں کے ہجوم اور نئے نئے امراض کے شیوع کو دیکھتے ہوئے ان کا یہ قیاس غلط نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن مسٹر ہینسن (L. A. Henshaw) نے امریکہ کے رسالہ Life and Health (زندگی و صحت) میں جو اعداد شایع کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم اس ملک کے متعلق یہ خیال صحیح نہیں ہے۔

ان اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ میں سنہ ۱۸۰۰ء میں اوسط درازی عمر ۳۳ سال سنہ ۱۸۵۵ء میں ۴۰ سال اور سنہ ۱۹۲۰ء میں ۵۸ سال تھی گویا کہ سنہ ۱۸۵۵ء کے مقابلہ میں اب انسان کی عمر میں ۱۸ سال کا اضافہ ہوا۔ اسی سلسلہ میں ناظرین کے لئے یہ معلوم کرنا باعث

دلچسپی ہوگا کہ درازی عمر کے بارے میں امریکہ کا نمبر پانچواں یا چھٹا ہے، نیوزیلینڈ (New Zealand) اس معاملے میں سب سے اول ہے، وہاں اوسط عمر ۶۰ سال ہے، آسٹریلیا، فنلینڈ، ناروے، سویڈن، ہالینڈ کا نمبر اس کے بعد آتا ہے، غریب ہندوستان اس معاملے میں سب سے پیچھے ہے یہاں اوسط عمر ساڑھے بائیس سال ہے!

شرح اموات میں بھی یہی فرق نظر آتا ہے، مختلف سالوں میں امریکہ میں اوسط شرح اموات فی ہزار حسب ذیل رہی —

۱۷	سنہ ۱۹۱۱ ع
۱۲.۳	سنہ ۱۹۲۳ ع
۱۱.۶	سنہ ۱۹۲۳ ع

حالانکہ ہمارے ملک میں بھی شرح ۳۷ فی ہزار ہے!

موٹروں میں جو برقی مورچے ہوتے ہیں ان میں بجلی کی رو رواں کرنے کے لئے اب تک یا تو کھٹکوں سے کام لیا جاتا تھا یا دستہ سے، لیکن اب ایسے مورچے (Batteries) بنائے گئے ہیں جن میں صرت آواز کی تہوجات سے رو جاری ہو سکتی ہے۔ آئندہ موٹر چلانے والے اسے ”چالو“ (Start) کرنے کی دقتوں سے بچ جائیں گے اور جس طرح جانوروں کو پکار کر چلایا جاتا ہے، اسی طرح پچکار کر موٹروں کو بھی چلایا جائے گا۔

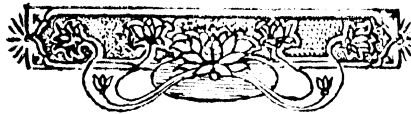
جرمنی اپنی حیرت انگیز کیمیاوی ایجادوں کے لئے ہمیشہ مشہور رہا ہے، اسی ملک کے کیمیا دانوں نے پہلے مصنوعی طور پر فیل بنا کر ہندوستانی قدرتی فیل کو میدان سے ہٹایا، اور کارخانوں میں مصنوعی طریقوں سے نائٹروجن (Nitrogen) پیدا کر کے جنوبی امریکہ کی شوریہ سازی کی صنعت کو صدمہ پہونچایا۔ اب اطلاع ملی ہے کہ پروفیسر برگیس (Burgius) اور پروفیسر فشر (Fischer) متعدد تجربات کے بعد کوئلے سے پٹرولیم نکالنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ حکومت جرمنی نے اس تجربہ کی تکمیل کے لئے ۲۶۰۰۰۰۰ روپیہ منظور کئے ہیں۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ۶۰ من کوئلے سے تقریباً ۳۰ من تیل نکالا جاسکے گا۔ یہ تیل معمولی قدرتی پٹرولیم کے مقابلے میں بہت کم دھواں دیتا ہے، دیکھنا ہے کہ یہ ایجاد کوئلہ کی صنعت پر کیا اثر ڈالتی ہے؟

اب تک گھڑی کی سوئیوں سے وقت کا اندازہ لگایا جاتا تھا، لیکن اب ایسی گھڑیاں بنائی گئیں ہیں جن میں سوئیوں کی ضرورت نہیں ہوتی، اور موٹر کے رفتار پیما (Speedometer) کی طرح خود بخود ہندسے نمودار ہوتے رہتے ہیں، مثلاً سوا دس بجے گھڑی کی کھڑکی میں حسب ذیل ہندسے آتے ہیں —

10	15
----	----

یہ گھڑی بجلی کی قوت سے چلتی ہے، اور چونکہ سوئیوں کے مقابلے میں ہند سے زیادہ آسانی کے ساتھ وقت بتا سکتے ہیں، اس لئے یہ ریلوے اسٹیشنوں کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔

زرائع جدید میں طباعت اور صحافت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں تصویریں بہت کثرت سے استعمال کی جاتی ہیں، اور اس کے فوائد سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا، لیکن عکس اندازی (Photography) میں اب تک سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ وقت بہت صرت ہوتا تھا، اب ایک ایسی مشین ایجاد ہوئی ہے جو ایک گھنٹہ میں ۱۰۰۰۰ اعلیٰ درجہ کے آرٹ فوٹو تیار کر سکتی ہے، اس کی تصویروں کی تیاری کے لئے اندھیرے کی ضرورت نہیں ہوتی، اگر اس کا استعمال عام طور پر ہو نہ لگے تو ملک میں مصور رسالوں، کتابوں اور اخباروں کی کوئی کمی نہ رہے، اور ہندوستانی طباعت کی ایک بڑی مشکل حل ہو جائے۔



اخبارِ کلیہ

جشنِ یومِ کلیہ | ہماری گزشتہ دو مہینوں کی زندگی کا سب سے زیادہ دل چسپ اور یادگار واقعہ یہی ہے، گزشتہ آذر میں ہمارے کلیہ نے اپنی زندگی کے دو سال ختم کر لئے، اس جشن کے منانے کی یہی وجہ تھی، سفر کے مرحلوں کی طرح، زندگی کی منزلوں کا بھی کچھ نہ کچھ نشان ہونا چاہئے، خواہ یہ زندگی اداروں کی ہو یا افراد کی۔ اس سے منزل کے جائزے میں سہولت ہوتی ہے، یہ پیچھے دیکھنا، آگے بڑھنے کے لئے ہوتا ہے۔

دیوالی کی تعطیلات (۱۱-۱۲-۱۳ آذر سنہ ۳۵ ت) میں یہ تقریب منائی گئی، ایک ہفتہ پہلے انتظامات شروع ہوئے۔ کالج کی آرائش کی گئی، سامنے کے حصے اور پہلوؤں پر نفیس بیل بوتے بنائے گئے۔ دیواریں سجائی گئیں، کاغذ کے پھولوں اور خوشنما بیلوں سے کالج اور اس کا ہال دلہن بن گیا۔ آرائش و تزئین کا کام جناب معہود علی صاحب صدر مہتمم مدرسہ صنعت و حرفت، جناب قاضی فضل الدین صاحب ٹرائنگ ماسٹر کالج، جناب نظیر محمد خاں صاحب ٹرائنگ ماسٹر مدرسہ تعلیم المعلمین اورنگ آباد اور جناب رنگناتھ صاحب و شیخ امام صاحب ٹرائنگ ماسٹر مدرسہ وسطانیہ

نے اپنے ذمہ لیا، اس کا تھام سہرا انہی اصحاب کے سر ہے —
 جشن سے کچھ روز قبل دور و نزدیک کالج کے خیر خواہوں
 کے نام دعوتی رقعے تقسیم کئے گئے تھے اور ایک روز پہلے
 ہمارے یہ محرز مہمان تشریف لائے، حیدرآباد سے جو اصحاب
 اس میں شریک ہوئے وہ حسب ذیل ہیں: —

جناب مولوی حمید احمد صاحب انصاری مسجل
 جامعہ عثمانیہ

جناب مولوی عظمت اللہ خان صاحب مددگار
 ناظم تعلیمات

جناب مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ
 جامعہ عثمانیہ

جناب مولوی شبیر حسن صاحب جوش ملیح آبادی
 رکن دارالترجمہ

جناب مولوی عبداللہ العہادی صاحب رکن
 دارالترجمہ

جناب مولوی محمد عبدالعی صاحب پروفیسر
 کلیہ جامعہ عثمانیہ

جناب مسٹر نعمت اللہ بیرسٹر ایت لا

حیدرآباد کے علاوہ دوسرے مقامات سے بھی اکثر اصحاب

تشریف لائے تھے۔ ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں: —

جناب مولوی نظیر حسین صاحب فاروقی مہتمم
 تعلیمات ضلع نظام آباد

جناب مولوی ثابت علی صاحب منصف فاندیز

جناب مولوی میر ہاشم علی خاں صاحب ناظم
عدالت ناندیڑ

جناب مستر ت۔ ب۔ کامت مہتمم تعلیمات پر بھنی

ان سب مہمانوں کو جناب صدر نے اپنے یہاں تھیرایا۔

ان بزرگوں کے علاوہ کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے فرائض
منصبی یا دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے شرکت تو نہ
فرما سکے لیکن جنہوں نے تاروں اور خطوں کے ذریعے سے اس
تقریب کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی۔ ان کے اسماء گرامی
یہ ہیں:—

جناب نواب حیدر نواز جنگ بہادر صدر المہام
فنانس

جناب نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات

جناب نواب صدر یار جنگ بہادر صدر الصدور

جناب نواب سراج یار جنگ بہادر جج ہائی کورٹ

جناب نواب فخر یار جنگ بہادر معتمد فنانس

جناب نواب اکبر یار جنگ بہادر معتمد عدالت

و کو توالی و امور عامہ

جناب مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم سرشتہ

آثار قدیمہ

جناب مولوی عبدالرحمن خان صاصب صدر کلیہ

جامعہ عثمانیہ

جناب مولوی معتمد عنایت اللہ صاحب ناظم

سرشتہ تالیف و ترجمہ

جناب مولوی رحیدالدین صاحب سلیم پروفیسر
کلیہ جامعہ عثمانیہ

جناب مولوی محمود احمد خان صاحب پروفیسر
کلیہ جامعہ عثمانیہ

جناب مولوی سید محمد مہدی صاحب مددگار
ناظم سرشتہ انجمن ہائے اتحادی

جناب مولوی مرزا محمد بیگ صاحب مہتمم
تصفیۂ اراضیات

۱۱ آذر سنہ ۳۵ ف کو پانچ بجے شام کے وقت اس تقریب کا آغاز ہوا پہلے کھیل ہوئے ان کے انتظامات کا سہرا حسب دستور پروفیسر محمد ابرہیم صاحب ایم۔ اے، اراکین گیہس کمیٹی اور کالج کے رضا کاروں کے سرھے، اسی روز شام کو کالج ہال میں جلسہ ہوا، صدر صاحب کلیہ نے سہانوں کا خیر مقدم کیا۔ مولوی غلام طیب صاحب بی۔ اے۔ یل۔ ٹی مددگار نے اپنی بلند پایہ نظم دیس کھانی سنائی اور حاضرین کو معظوظ کیا، حضرت جوش مایح آبادی نے بھی اپنی اعلیٰ درجہ کی نظم ”آفتاب“ سنائی اور جلسہ سے تحسین سنی، اس کے بعد جناب سید ہاشمی صاحب رکن دارلترجمہ نے اپنا پرمغز مضمون پڑھا جو ناظرین صفحات گزشتہ میں دیکھ چکے ہیں۔ سکستہ فارم کے طلباء نے شکسپیئر کے مشہور ناولتک مرچنٹ آف وینس (Merchant of Venice) سے عداوت کا سین کھیلا، سب سے

اچھا پارت ڈاؤر کرنے کیا، یہ پورٹیا (Portia) بنے تھے، جناب مسجل صاحب جامعہ عثمانیہ نے اس کی قدر دانی فرمائی، اور انہیں ایک طلائی تھغا دیا، اس جلسہ میں مقامی عہدہ دار، وکلا اور دیگر معززین بھی بڑی تعداد میں شریک ہوئے، اور ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

دوسرا دن (۱۲ آذر) صرف کھیلوں کے لئے مخصوص تھا، اس کے مقابلے ہوئے ارر سات بجے شام تک ہوتے رہے۔

تیسرے دن آذر ہماری تقریب کی آخری تاریخ تھی اور اس دن سب سے زیادہ سامان تفریح فراہم کیا گیا تھا، پہلے کھیل ہوئے، پھر انعامات تقسیم کئے گئے، اس کے بعد جناب صدر کی طرف سے ایک پر تکلف ایت ہو م دیا گیا، اور جلسہ برخاست ہوا، سارے آٹھ بجے شب سے پھر اجتماع شروع ہوا، اگرچہ جگہ کا کافی انتظام کر لیا گیا تھا، لیکن حاضرین کی کثرت کی وجہ سے اس کی دقت محسوس ہوئی، اس دن یہ بزم میدان میں شامیانوں کے فیچے جھی، ایک اسٹیج تیار کیا گیا تھا، جناب مولوی یوسف علی صاحب ایچ۔سی۔ایس زاید صدر منصف کی عنایت اور کوشش سے ایک مقامی کھپنی سے پردے مل گئے ان کے لگانے کے انتظام میں جناب مولوی جھیل احمد صاحب صدر مہتمم تعمیرات اورنگ آباد، جناب مولوی نظام الدین صاحب مہتمم تعمیرات اورنگ آباد، اور جناب عبدالعزیز صاحب اورسیر نے خاص طور پر مدد کی، ان حضرات کی

امداد کے بغیر یہ کام ناممکن تھا، ہمارے ہر دل عزیز
مددگار نواب الدین صاحب اس انتظام کے نگراں تھے اور ان
کے ماتحت رضا کاروں کی مدد کے بغیر یہ بیل منڈھے
نہ چڑھتی

اس جلسہ کا نظام العمل بہت دلچسپ تھا، طلباء نے نظمیں
سنائیں، اردو، مرہٹی، فارسی، ہندی انگریزی، عربی،
ان سب زبانوں میں نظم خوانی ہوئی اور حاضرین بہت
محظوظ ہوئے، نظموں کا انتخاب موقع کی مناسبت سے کیا
گیا تھا، اور سب نے انہیں پسند کیا، پھر اس روز کا سب
سے زیادہ دلچسپ حصہ، مولیر (Moliere) کا ڈراما ”نکاح
بالجبر“ شروع ہوا یہ ڈراما کالج کے اساتذہ نے کیا تھا، اسے
ناظرین گزشتہ اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہ ڈراما
اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نیا تھا اور بہت مقبول ہوا
جناب مولوی قاسم حسین صاحب دوم تعلقدار نے ”علامہ خجندی“
کو ایک طلائی تہنہ عنایت فرمایا، اس ڈرامے کے چرچے آج
تک باقی ہیں۔

ڈرامے کے بعد حضرت جوش ملیح آبادی نے اپنے مخصوص
دلکش انداز میں اپنی وہ نظم سنائی جو ناظرین اس رسالہ
میں پائیں گے اور حاضرین کو مسحور کر لیا، خوب داد دی گئی
اور فی الحقیقت یہ نظم اس تعریف و توصیف کی مستحق بھی
ہے۔ اخیر میں جناب صدر صاحب کلیہ نے حاضرین کا شکریہ
ادا کیا اور انہیں الوداع کہی۔ اس کے بعد یہ جلسہ

برخواست ہوا—

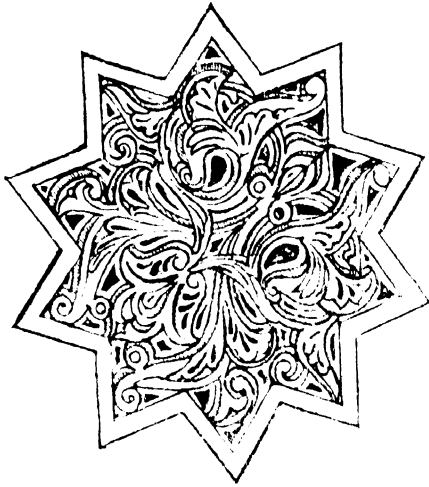
ہمارا یہ جلسہ اس شہر میں اپنی قسم کا پہلا جلسہ تھا ، اور بہت کامیاب رہا۔ اس کو ختم ہوئے دو مہینے ہوئے کو آئے۔ لیکن ان پر لطف ایام کی یاد اب تک باقی ہے ، اور آج بھی اس کے تذکرے ہوتے ہیں—

ہمارے کلیہ کے اساتذہ اور طلبا نے اس تقریب کو کامیاب بنانے میں جو حصہ لیا ، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ ہر شخص نے جس سے جو کام بن آیا ، کیا ، دوسری قابل فخر بات یہ ہے کہ ”سخنے“ اور ”قدمے“ ہی نہیں بلکہ ان سب نے ”درمے“ بھی اس کی مدد کی۔ جناب صدر نے پچاس روپیہ بطور چندہ دیے اور ایتھوم دیا ، اساتذہ کلیہ نے ہنسی خوشی اپنی تنخواہوں کا پانچ فیصدی پیش کیا ، طلبا نے شوق کے ساتھ چندے دیے۔ ہمارا یہ جشن فی الحقیقت اس بات کا ایک عملی ثبوت ہے کہ بے غرضانہ کام اور متفقہ سعی کیا کچھ نہیں کر سکتے !

ہماری دعا ہے کہ ہم اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں اسی طرح ہر سال اپنے گزشتہ کارناموں کا جائزہ لیا کریں۔ اور خدا کرے یہ کارنامے ہمیشہ قابل فخر ہوں ، موجودہ تقریب فی الحقیقت ایک مبارک رسم کا

آغاز تھی، ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ ہم
اپنے معزز مہمانوں کو زیادہ عرصہ تک نہ تھیرا
سکے اور بات کی بات میں یہ تین دن گزر
گئے۔

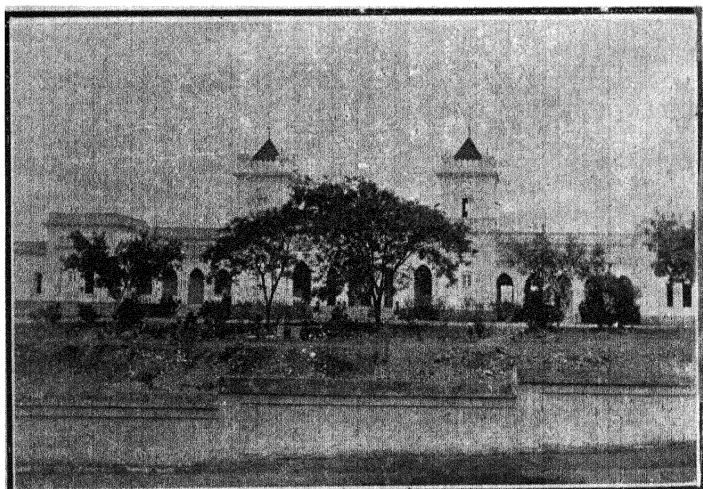
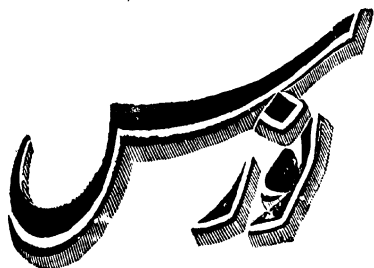
خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود



نمبر ۳

جنوری سنہ ۱۹۲۶ء

جلد



اوزنگ آباد کالج کا دو ماہی رسالہ

انجمن اُردو کے مطبع میں چھپا

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	شذرات	آدیتر	۱
۲	آوارہ خوانی	احمد حسین صاحب قدوائی	۹
۳	”ارض دکن سے خطاب“	جناب عبدالقدیر صاحب قدیر اورنگ آبادی	۲۷
۴	واہمہ کی نیرنگیاں	محمد حقیظ الرحمن طالب علم میٹرک کلاس	۳۰
۵	ملک علیہ کے نوکھندے سے خطاب	جناب محمد عباس صاحب اقدس مذشی عثمانیہ کالج اورنگ آباد	۹۳
۶	نظاریۃ جبلت کی تردید	سید عسکری حسین متعلم سال دوم ایف اے عثمانیہ کالج اورنگ آباد	۴۱
۷	مسرت و نمائش	افضل حسین صاحب فاروقی متعلم نظام کالج حیدر آباد دکن	۴۷
۸	من کی موج	من موجی	۵۲
۹	ہندوستان کی سب سے پہلی کرنسی کمیٹی سالہ ۱۷۸۷ عیسوی	ایس ایم جگتاپ و مرتضیٰ خاں متعلمین سال دوم عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن	۸۵
۱۰	اخبار علمیہ		۶۹
۱۱	اخبار کلیہ		۷۶

شدوات

ہندوستان میں بہت عرصہ سے یہ بات دیکھنے میں آ رہی ہے کہ ملک کی مختلف سیاسی اور معاشرتی مذہبی اور عوامی انجمنیں ختم سال کے موقع پر اپنی اپنی سالانہ رسمیں ادا کرتی ہیں اور کیارہ مہینے تک عملی کام کی جو کچھد بھی رہی ہے اس کی تلافی بارہویں مہینے دھوم دھام کی تقریروں سے کیا جاتی ہیں۔ چنانچہ دسمبر سنہ ۲۵ع کے آخری ہفتہ میں علی اڈہ کی مسلم یونیورسٹی نے بھی اپنی پچاس سالہ جوابی نمائی۔ اس جشن کا اہتمام بہت بڑے پیمانے پر کیا گیا تھا، مہینوں پہلے سے اخبارات اور خطوط کے ذریعہ اس کی شہرت ہوئی تھی، مختلف صوبوں میں وفد بھیجے گئے تھے کہ وہ مہمانوں کو فراہم کریں، جشن کو کامیاب بنانے کے لئے اور لاپسبیاں بھی فراہم کی گئی تھیں۔ ایجوکیشنل کانفرنس، نائٹیم کانفرنس، مسلم لیگ راجپوتہ نے بڑی اس مرتبہ اپنے اجلاس علی اڈہ میں گئے۔ جہاں تک رونق اور چہل پہل کا تعلق ہے، علی اڈہ کا پچھلے سال کا آخری ہفتہ اپنی آپ نظائر ہے۔ ہم اسے برسوں کے جہد کی تلافی سمجھتے ہیں اور اسی میں خوش ہیں۔

تقسیم اسناد نضیات کے موقع پر جو ذابہ پنجاب کے مایہ ناز بیرسٹر اور مشہور اہل قلم شیخ عبدالقادر صاحب نے پڑھا وہ بہت قابل قدر ہے، موصوف نے مسلم یونیورسٹی کے متعلق جو تجاویز پیش فرمائی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ان پر ارباب جامعہ غور کی نظر قابو، اور کاربند ہوں یونیورسٹی کو اصلی معنوں میں تعلیمی درسگاہ کیوں کر بنایا جائے، السنہ مشرقی کو ان میں کیا حصہ دیا جائے، کارپردازان جامعہ کا صحیح مطمح نظر کیا ہو، یہ اور اسی قسم کی دوسری باتیں صرف اس قابل نہیں ہیں کہ انہیں جشن کی دھوم دھام میں فراموش کر دیا جائے۔ ان پر توجہ

اور عمل کی ضرورت ہے —

یہ زمانہ جو گزر رہا ہے ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے لئے عموماً اور عالیٰ نڈہ کی یونیورسٹی کے لئے خصوصاً سخت امتحان کا زمانہ ہے۔ اس سال مختلف یونیورسٹیوں میں جو خطبات پڑھے گئے ہیں، ان پر غور کی نظر ڈالئے، لارڈ لٹن نے کانگرس میں، سر جمن لال ستیاواہ نے بھیمی میں، سر تیج بہادر سپرو نے لکھنؤ میں، نواب حیدر نواز جنگ بہادر نے لاہور میں اور خد ہمارے نواب امیر جامعہ نے حیدرآباد میں، زبان، ذریعہ تعلیم، مقصد تعلیم وغیرہ کے متعلق جو اشارے کئے ہیں انہیں سمجھئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستان اپنی درسگاہوں سے کس چیز کی توقع رکھتا ہے۔ دہلی نڈہ کو ”اردو فرازی“ کے جو موقعے حاصل ہیں وہ شہابی ہندوستان کی کسی اور جامعہ کو میسر نہیں ہیں۔ جو اچھے ابتدائی وقتیں تھیں انہیں ہماری جامعہ دور کر چکی ہے۔ وقت ہے کہ اس روشن مثال پر غور کیا جائے۔ برج اور شاہجہاں آباد کے پڑوس میں انگریزی زبان کی گرم بازاری کب تک رہیگی! غیروں کی ترجمانی سے کہاں تک کام چلے گا!!

جشنِ جوبلی کے ایام میں جتنی کانفرنسیں ہوئیں، ان میں آل انڈیا مہتمن ایجوکیشنل کانفرنس اور اردو کانفرنس اور مسلم اخبارات کے اہلکاروں کی کانفرنس تعلیمی اور ادبی لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ —

ایجوکیشنل کانفرنس کا خطبہ صدارت پشاور میں قوم سر ملک عبدالقیوم خان صاحب نے پڑھا۔ اس میں اکثر و بیشتر کام کی باتیں اور دہلی تدبیریں بتائی گئی تھیں۔ اسے عام طور پر پسند کیا گیا۔ اس کے بعد متعدد قراردادیں پیش ہوئیں۔ یہ وہی تھیں جو بارہا منظور ہو چکی ہیں مگر بہت کم عمل ہوا ہے۔ یہ کانفرنس ابھی تک پرانے تھوڑے پر چلی جا رہی ہے اور حالانکہ حالات بدل چکے ہیں اور تعلیم کے مسئلہ نے نئی نئی صورتیں اختیار کر لی ہیں مگر یہ وہی پرانی لکیر پیٹے چلی جاتی ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس

اس وقت ایک بے جان اور بیکار جماعت معلوم ہوتی ہے۔ اگر موجودہ حالات کو مد نظر رکھ کر اس کی از سر نو تنظیم کی جائے اور تعلیم کے مسئلہ پر غور کر کے ماهر اور تجربہ کار لوگوں کی رائے لی جائے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے تو یہی کانفرنس ایک بڑی قوت ہو سکتی ہے۔ اس زمانے میں اسے زندہ کرنے اور باقاعدہ بنانے کی شدید ضرورت ہے۔ آفریدی سرگرمی جو روشن خیال بزرگ ہیں اور عامی کاموں سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں، اگر توجہ فرمائیں تو اس کی اصلاح و تنظیم کوئی بڑی بات نہیں اور یہ ان کے زمانہ معتمدی کی بڑی یاد گار ہوگی۔

اردو کانفرنس، جس کا اجلاس اس ہفتہ جشن میں سب سے اول ہوا، خلاف توقع بہت معمولی رہی۔ جس شان سے اس کی تیاری کی گئی تھی اور اشتہار دئے گئے تھے، اُس شان کی اس کی کارروائی نہ تھی۔ دو دن کی کارروائی دیکھ کر ہمیں کسی قدر مایوسی ہوئی۔ اس کی طرز کارروائی کا بھی وہی تہنگ تھا جو سالہا سال سے ایجوکیشنل کانفرنس کا چلا آ رہا ہے۔ ہماری رائے میں عامی اور ادبی مسائل کے لئے اس قسم کا ہجوم اور شور و غوغا کچھ زیادہ مناسب نہیں۔ بعض اچھے اچھے زور و لہجہ منظر ہرے مثلاً اردو کو ہندوستان کی عام اور مشترکہ زبان بنانے کی کوشش، اردو تائپ کی ترویج وغیرہ لیکن ایسی قرار دادوں کا صرف منظر ہو جانا کافی نہیں جب عملی کارروائی نہ کی جائے۔ اگر یہ کانفرنس اپنی قرار دہن کو عملی صورت میں نہیں لاسکتی تو کانفرنس کا وجود بیکار ہے۔ مسام اخبارات کے ادیبوں کی کانفرنس اگرچہ کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہی لیکن اس کا قایم ہونا ایک نیک فال ہے۔ اس کانفرنس کے بانی اور عامل زیادہ دانشمندانہ کہ انہوں نے ایک عام اجلاس کے بعد ادیبوں کا ایک اجلاس بھی منعقد کیا اور اس میں انہوں نے ایک ذیلی مجلس قائم کی جو اس کانفرنس کے قواعد اور ضوابط تیار کرے گی۔ اردو اخبارات کو رہنمائی کی بہت ضرورت ہے اور اگر اس کانفرنس نے اتفاق اور دلدادگی سے اپنے فرائض ادا کئے تو یہ ایک بہت بڑا قومی کام انجام دے گی۔ کانفرنس کے صدر خاں بہادر مولوی

بشیر الدین صاحب کا خطبہ ایک وسیع تجربہ پر مبنی تھا اور اس میں بہت سی مفید اور کامی باتیں تھیں جن پر کانفرنس کو اپنے آئندہ اجلاسوں میں ضرور غور کرنا چاہئے۔

فورس کے گزشتہ نمبر میں ہم ایک ہندی مستشرق مہارشی گوپال کرشن بھنڈارکر کا ماتم کرچکے ہیں۔ اب ایک محب ایران، یورپی مستشرق مسٹر ابدارہ براؤن کی وفات کی خبر سنا رہے ہیں۔ عالمی دنیا کے لئے یہ موت سانحہ سے کم نہیں ہے۔ مسٹر براؤن کیہ برج یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر اور فارسی زبان کے محقق اور ماہر تھے۔ ۱۸۸۰ میں جب ان کی عمر ۱۸ سال کی تھی، انہیں فارسی کا شوق ہوا۔ یہ شوق بڑھتے بڑھتے عشق کی حد تک پہنچ گیا، ۱۸۸۷ میں خود ایران گئے اور ایک سال تک وہاں قیام کیا، یورپ کو اور خود ایران کو فارسی ادب کے جواہر ریزوں سے آشنا کرانے والا یہی انگریز نژاد محقق تھا! عوفی کا تذکرہ، ایرانی ادبیات کی تاریخ، جس کی اخیر جلد ابھی حال میں شائع ہوئی ہے، چہار مقالہ نظامی عروضی کا ترجمہ اور اس کا مقدمہ، ایرانی انقلاب کی تاریخ، اور ایسی ہی دوسری تصانیف، جب تک فارسی زبان بولنے والے زندہ ہیں، زندہ رہیں گی۔ قومیت اور مذہب کے اختلاف کے باوجود نہایت وسیع النظر تھے۔ ایرانیوں سے کہاں درجہ محبت رکھتے تھے۔ ان کی کتاب *Press and Poetry in Modern Persia* کے تائید کو دیکھو، زرین حررت میں ”پایندہ باد مشروطۃ ایران“ لکھا ہوا نظر آئے گا۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس سال عیسوی نے ایران کے تخت کو شاہان قاجار سے خالی کرایا، اسی نے ایرانی ادب کے ایک رکن رکیں کو بزم حیات سے اتھایا!

موصرت نے پینسٹھ برس کی عمر پائی، دنیاوی اور انسانی حیثیت سے دیکھو تو یہ مدت حیات طویل نظر آتی ہے، لیکن عالمی حیثیت سے دیکھو تو پہی کہنا پڑے گا:- خوش درخشید رائے شعلہ مستعجل بود!

کلامتہ کے فارسی اخبار حبل المتین نے ان کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے اہل فارس سے استدعا کی ہے کہ وہ اس ”فیلسوف

یگانہ و مستشرق فرزانه“ کی ایک یادگار قایم کریں، معزز ہم عصر معارف بھی ایک براون نمبر نکالنا چاہتا ہے، ہماری آرزو ہے کہ یہ ارادہ جلد از جلد عملی صورت اختیار کرے اگر بالراست نہیں، تو بالواسطہ ہی، مرنے والے کا ہندوستانیوں اور اردو پر کچھ، نہ کچھ احسان ہے، شہید عام کو بھی زندہ رہنے کا کچھ حق تو ضرور ہے —

نورس کے پچھلے نمبر کے شذرات میں ہم نے ان کوششوں کا ذکر کیا تھا جو ایک مدت سے یورپ میں جگت بھاشا کے متعلق ہو رہی ہیں اور اپنے ملک کے اہل قلم حضرات سے درخواست کی تھی کہ وہ بھی ہندوستان کے لئے کرٹی ”بھارت بھاشا“ بنائیں۔ اسی سلسلہ میں ناظرین اس خبر کو دلچسپی کے ساتھ سنیں گے کہ کاکتہ کے مشہور انگریزی رسالہ ماترن ربوریو نے اپنے جذوری نمبر میں مسٹر س۔ م۔ گوہلے کا ایک مضمون شائع کیا ہے، یہ مضمون امریکہ سے لکھ کر بھیجا گیا ہے ناضل صاحب مضمون نے پہلے تو وہ خصوصیات بتائی ہیں جن کے بغیر کوئی زبان مشترکہ زبان بن ہی نہیں سکتی۔ مثلاً تحصیل کی سہولت، ادبی ذخیرہ، قراءت کی یکسانی بولنے والوں کی کثرت وغیرہ اور پھر بنگالی زبان کو ان خصوصیات کا حامل بتا کر اسے بطور بھارت بھاشا کے تجویز کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مضمون سطحی ہے اور گہری بحثوں سے قصداً پہلو بچایا گیا ہے لیکن اشارے کی حیثیت ضرور رکھتا ہے۔ اردو زبان کی بدنصیبی دیکھئے، کہ مضمون نگار ہندی زبان کا ذکر کرتے ہیں، اس کے ادبی سرمایہ کو پرکھتے ہیں، اور پھر اس کے خلاف فیصلہ صادر کرتے ہیں، لیکن ہندوستانی زبانوں کے اس سبھا میں غریب اردو کو بار نہیں ملتا، حالانکہ اگر آج کسی زبان میں اس ”صد گرفتار و صد دستار“ ملک کی مشترکہ بھاشا بننے کی صلاحیت ہے تو وہ زبان اردو ہی ہے۔ ہم کسی آئندہ نمبر میں اس مضمون کا ترجمہ ہدیہ ناظرین کریں گے سر دست صرف ہوا کا رخ بتانا مقصود تھا: —

قائلے دیکھ، اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہرو خوابیدہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ

ہندی زبانوں کو بگاڑنے یا سنوارنے اور ان کے مستقبل کو روشن یا تاریک بنانے کا جیسا موقع آج کل ہے، ہندوستان کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ آیا ہوگا۔ اگر ایک طرف ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں آج مغربی علوم کی صداے باز گشت سنائی دے رہی ہے، تو دوسری طرف ہندی قومیت بنام لے رہی ہے۔ یہی زمانہ اس بچے کی زبان کھانے کا ہے۔ اگر آج اس نے اپنی زبانوں میں اظہار خیال کی قدرت نہ پائی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سات سمندر پار کی زبانوں کو اپنی دیوبانی سمجھے گا۔ اردو کی بہنیں اس موقع کی اہمیت کا احساس کر رہی ہیں، ہندی سہیلن، فاگوری، پ۔ چارنی سبھا، پوفہ کا بینادار کر افسٹی ٹیوٹ، الہ آباد کا انڈین پریس، بنگالی اور گجراتی زبانوں کے من جملے ادیب سب اس تاک میں ہیں کہ زبان کھاتے ہی یہ بچہ ہمیں منتخب کرے، یہ سب کے سب بدلے ہوئے حالات کا ساتھ دے رہے ہیں، لیکن اردو کی بد نصیبی دیکھئے کہ خود اس زبان کے ادیب زبان ہندی پر کھر بستہ ہیں۔ اگر کوئی جدت پسند طبیعت افوھے اسلوب بیان سے کام لیتی ہے، کوئی نئی اصطلاح وضع کرتی ہے، یا خیال کا کوئی نیا سانچہ تہووندہ نکالتی ہے تو ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس ”بدعت“ کے خلاف فتے صادر ہوتے ہیں، اور ان پر ایسے ایسے اصحاب فن کی بھی مہریں نظر آتی ہیں جنہوں نے اپنی عمر کا معتد بہ حصہ اس زبان کی ظاہری یا معنوی خدمت کی نذر کر دیا ہے! —

جن حضرات نے جنوری کے ”رسالہ زمانہ کانپور“ اور ”مرقع“ لکھنؤ، کو غور سے پڑھا ہوگا وہ ضرور ہمارے خیال کی تائید کریں گے۔ اگر ایک میں ”ادب الکاتب“ کے پردے میں اردو زبان کا گلا گھونٹا گیا ہے، تو دوسرے میں ”اردو زبان کی قدامت“ کو عنوان قرار دیکر بعض جدید

نظموں، اور الفاظ کی مذمت کی نئی ہے، ان دونوں مضامین کے لکھنے والے ایسے لوگ ہیں، جن کی جگہ بڑے عرصہ سے اردو خواہوں کی پہلی صف میں محفوظ ہے، ”کسی مسئلہ پر روشنی ڈالنا“، ”عہلی جامہ پھانسا“، ”سہاج“ اور اسی قسم کے اثر و بیشتر جہاں اور لفظوں کو گردن زدنی قرار دیا گیا ہے، اور یہ کیوں؟ محض اس لئے کہ ”متقدمین کی سند نہیں ہے“! اسی طرح سے جامعہ عثمانیہ کی اثر اصطلاحوں کی خردہ گیری کی نئی ہے، اگرچہ ہم یہاں اس موضوع پر تفصیلی بحث کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہم حضرت نظم طباطبائی اور حکیم بہم جیسے بزرگوں سے کچھ تعرض کرنا چاہتے ہیں بقول غالب ”اٹلے رقتوں کے ہدیٰ یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو“ پھر بھی انداعرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ دوسری زبانیں بولنے والوں کے ”آداب کاتب و شاعر“ اردو نظم و نثر کی کسوٹی نہیں بن سکتے اور نہ ابن رشد کے اصول بیان و معافی بیسویں صدی کی اردو زبان پر صادق آسکتے ہیں۔ زبانوں کے بڑھنے اور پھیلنے کی راہ تقلید ہے جا، اور قدامت پرستی دونوں کی شاہراہوں سے دور دور ہے۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کایں رہ کہ تو سی رہی بہ ترکستان است

یوں تو جامعہ عثمانیہ کا دارالترجمہ آٹھ سال سے اردو زبان کی خدمت کر رہا ہے اور اس کی کوشش سے اب ہماری زبان میں ایسے ایسے علوم پر بھی کچھ کتابیں نظر آتی ہیں جو پہلے اس میں نہ تھے، لیکن ابھی حال میں ان سب علوم کی اصطلاحات علمیہ کو یکجا کر کے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کی طرف سے شایع کیا گیا ہے۔ جملہ اہم علوم کی اصطلاحیں اور ان کے ترجمے اس کتاب میں آئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ترجمے پرانے مذاق کے اردو ادیبوں کو ناگوار ہوں گے، لیکن جب یہ علوم عام ہوں گے اور ہماری زبان میں بھی ان پر تصنیف تالیف ہونے لگے گی تو یہ بہتر نکل جائے گی، دیکھنا ہے کہ ملک اس کتاب کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

نوٹ:- ہمیں افسوس ہے کہ فورس کا یہ تیسرا نمبر خلافت
 معہزل بہت دیر میں شایع ہو رہا ہے، انجمن اردو
 کے پریس کو، جہاں ہمارا یہ رسالہ چھپتا ہے اس
 عرصہ میں غیر معہز ای مصروفیت رہی اور اس کا
 بار ہمارے رسالہ کو اٹھانا پڑا، ظاہر ہے کہ یہ کوئی
 عذر نہیں ہے اور نہ کوئی عذر ہو سکتا ہے، ہم اپنے
 معارفین سے معافی کے خواستگار ہیں۔



آوارہ خوانی

(از احمد حسین صاحب قدوائی سابق متعلم عثمانیہ کالج اورنگ آباد حال مدرس مدرسہ وسطانیہ اورنگ آباد)
 مقولے - ضرب المثلین - فصیح و بلیغ فقرے - انوکھی ترکیب - لفظی زبان کی خوبیاں یا جوہر ہوتے ہیں۔ جب کسی شخص کی زبان سے اضطراراً یا قصداً نکل جاتے ہیں اور اگر ان میں کچھ بھی دلکشی یا معنی آفرینی کی صلاحیت ہوتی ہے تو فوراً عوام کی زبانوں پر چڑھ جاتے اور قبولیت عام کی سند حاصل کرا لیتے ہیں اور ایک نئے تخیل کا اضافہ کرتے ہیں۔

آوارہ خوانی بظاہر تو ایک سیدھی سادی ترکیب لفظی ہے لیکن اس پر جہاں تک غور کیجئے اس کی وسعت بڑھتی جاتی ہے اور ایک جامع و مانع لفظ معلوم ہونے لگتا ہے۔ حضرت غالب کو اپنی ترکیب ماہ فیم ماہ پر برا ناز تھا تو آوارہ خوانی بھی کچھ کم باعث فخر نہیں۔ ایک بار یہ لفظ ایک محقق زبان و ادب کی لبوں پر جاری ہوا تو دفعۃً دل میں کھب گیا اور ہم نے اس کو اپنے مضمون کا عنوان بنا لیا۔

مولانا نذیر احمد کا قول ہے کہ مطالعہ کتب میں تو عاقلوں سے باتیں ہوتی ہیں اور کار و بار دنیاوی میں جاہلوں سے، مگر یہ قول تھام و کھال صحیح نہیں اور اس کلیہ میں استثناء بھی ہے ہر کتاب عاقل کی تحریر نہیں ہوتی اور نہ ہر گفتگو جہلا سے۔ سقراط تو تحصیل علم کے لئے کتابوں کو بالکل غیر ضروری خیال کرتا ہے کیونکہ وہ کہتا ہے کہ ان سے سوال و جواب ممکن نہیں اس لئے وہ ہم کو کچھ سکھلا نہیں سکتیں۔ یہ قول بھی نیم غلط ہے کیوں کہ کسی کتاب کے مطالعہ سے قبل ہمارے ذہن میں کوئی نہ کوئی سوال ضرور ہوتا ہے جس کا جواب کتاب سے ملتا ہے۔ اب جواب کا عاقلانہ و جاہلانہ ہونا دونوں ممکن ہیں۔ ایک انگریزی شاعر کا قول ہے کہ میں اپنی زندگی کے دن زندگی کی بجائے مردوں میں یعنی کتابوں کے درمیان گزارتا ہوں اور ایسے دوست نظر آتے ہیں جو مجھے کبھی نہیں چھوڑ سکتے اور نہ دھوکے کا کبھی ان سے خطرہ ہے۔

اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ آوارہ خوانی سے کیا مراد ہے اور آوارہ خوان کس کو کہتے ہیں؟ مولانا عبدالحق صاحب اس فاضلانہ مقدمہ میں جو انہوں نے ہاشمی صاحب کے ترجمے مشاہیر یونان و روم پر لکھا ہے فرماتے ہیں کہ ”میں ایک بد معاش اور پاجی آدمی سے باتیں یا بے تکلفی کرتے ہوئے جھپکتا ہوں اور آپ بھی اس فعل کو بری نظر سے دیکھتے ہیں لیکن جب ایسی کوئی کتاب پڑھتا ہوں تو نہ خود کو ناگوار ہوتا ہے نہ دوسروں کو۔ بد معاش کی کوئی

حرکت شاید ناگوار بھی ہو مگر کتاب ہے کہ اندر ہی اندر اپنا کام کر رہی ہے اور اس کی ہر بات دلربا معلوم ہوتی ہے۔ بازار میں کسی اجنبی سے بے تکلف باتیں کرنا تو ایک معجونانہ فعل ہے لیکن اسٹیشن پر جو پہلی کتاب نظر پڑے اس کو خرید کر پڑھنا کیا ہے۔ کسی اجنبی شہر میں جا کر بغیر مقصد مارا مارا پھرنا باوجود کثرت آبادی تنہائی سے زیادہ گراں معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک کتب خانے میں کبھی ایک الہامی کے پاس جانا کبھی دوسری دیکھنا۔ کبھی ایک کتاب اُٹھا کر پڑھنا کسی وقت دوسری۔ اس طرح سینکڑوں کتب دیکھنے پر بھی جب غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بھی نہیں پڑھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ آوارہ خوان وہ ہے جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔

زمانۂ حال میں جب کہ پریس کی آزادی نے کتابوں کی بھر مار کر دی ہے۔ اخبارات و رسائل برساتی کیتروں کی طرح فضا میں پھیل گئے ہیں ہماری زبان اُردو کا لٹریچر دن بدن وسیع ہوتا جاتا ہے تو معاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس بے مایہ زبان ہی کے ادب کا اگر کوئی شخص مکمل طور پر اور تفصیلی مطالعہ کرنا چاہے تو اس کے لئے عمر نوح درکار ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اُردو میں اب تک آٹھ ہزار سے زائد کتب لکھی جا چکی ہیں۔ اس صورت میں اگر کوئی شخص صرف کسی ایک شعبہ کو اختیار کر کے ”یکدرگیر“ پر عامل ہو تو شاید کچھ کر سکے ورنہ طلب الکل فوت الکل کا مصداق ہو کر رہ جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں اس کو یوں

کہہ سکتے ہیں کہ فی زمانہ علوم میں افقی ترقی تقریباً محال
 ہر گزئی ہے البتہ عمودی ترقی کے امکانات ابھی باقی ہیں
 کتب کی کثرت اور مطالعہ کی نوعیت ایک نئے شخص کے دل
 و دماغ کو مرعوب کر لیتے ہیں اور وہ اندھیرے میں تَتَوَلَّتْ
 ہے لیکن راستہ نہیں پاتا —

اسکات نے اپنے مشہور و معروف ناول Waverley میں ہیرو
 کے شوق مطالعہ کا یوں خاکہ کھینچا ہے کہ وہ کتابوں کے سمندر
 میں اس طرح تیر رہا ہے جیسا کہ ایک جہاز جس میں بادبان
 نہو- فیضی نے جب اپنے زمانے کی کتب مروجہ پڑھ لیں تو
 باپ سے سوال کیا کہ مجھکو کیا پڑھنا چاہئے، جواب ملا کہ
 پھر الف بے سے شروع کرو - مگر یہ اُس زمانہ کی باتیں تھیں
 کہ جب کتابیں نایاب یا کمیاب تھیں - اِس زمانہ میں جب
 طالب علم اپنی درسی کتب ختم کر کے مدارس سے نکلتے
 ہیں تو ان کی تربیت دماغی تو ہر جاتی ہے لیکن واقعی
 تعلیم اسکول اور کالجوں سے باہر نکلنے پر شروع ہوتی ہے -
 اب ہر شخص کے لئے یہ فیصلہ کرنا کہ اس کو کونسی کتب
 زیر مطالعہ رکھنا چاہئیں اور کیا نظر انداز کرنا ہو گا، بہت
 مشکل امر ہو جاتا ہے —

زندگی میں اس قدر مصروفیتیں ہوتی ہیں کہ ان کو
 کوئی ترک نہیں کر سکتا اور اگر کوئی صرت مطالعہ کو اپنی
 زندگی کا مقصد قرار دے لے تو اس کی زندگی محض ایک
 رہبانیت کی زندگی ہوگی جو دنیا کی ساری لذتیں چھوڑ کر
 صرت ایک طرف کی ہو رہی ہے اور تہدنی و معاشرتی حیات

سے محروم رہ گئی ہے۔ زمانہ گذشتہ میں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں اور ہمارے زمانے میں بھی ایسے اشخاص موجود ہیں جن کو شہدائے راہ علم و عمل کا خطاب دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم کو صرف ان لوگوں سے بحث ہے جو دنیاوی زندگی کے لوازم کے ساتھ ساتھ مطالعہ بھی جاری رکھنا چاہتے ہیں اور علوم و فنون کو بالاستیعاب حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ کونسا طریقہ اختیار کریں۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ مشکل سوال وقت کا ہے اس لئے ایسا طریقہ معلوم کرنا چاہئے کہ تھوڑے وقت میں کافی معلومات بہم پہنچ سکیں۔ اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ منتخب کتب و مضامین کا صرف مطالعہ کیا جائے۔ یا کسی خاص فن کی تحصیل کی کوشش ہو اور پڑھنے سے قبل ایک خاص مقصد یا سوال ذہن میں ہو اس کے ماتحت سب کچھ ہرنا چاہئے۔ لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جائے گا کہ اس انتخاب میں رہنمائی کون کرے؟ کسی کتاب کی خوبی یا قباحت بغیر پڑھے کیونکر معلوم ہو سکتی ہے؟ یہیں سے آوارہ خوان کی داستان شروع ہو جاتی ہے۔

بعض شوقین تو اس طرح کے ہوتے ہیں کہ جو کچھ رطب و یا بس سامنے آجاتا ہے بے تکلف پڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور بغیر کتاب کو ختم کئے نہیں چھوڑتے۔ بلکہ بعض تو ایسے کیڑے ہوتے ہیں کہ اخباروں کے اشتہارات کا ایک ایک حرف پڑھ لیتے ہیں اس کے بعد انہیں پتہ چلتا ہے کہ محض تضحیک اوقات ہوئی۔ لیکن بکثرت ایسے لوگ ہیں جنہیں یہ بھی حس نہیں ہوتی ایسا

مطالعہ محض بے کار ہے اور ان کا کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہوتا دراصل ایسی کتب دنیا میں بہت کم ہیں جو اول سے آخر تک صرف قیہتی اطلاعات پر مشتمل ہوں اور ناظر کی معلومات میں کچھ نیا اضافہ کریں ورنہ عموماً ہر کتاب میں برائے بیت یعنی بھرتی کے مضامین بکثرت ہوتے ہیں بعض بڑی ضخیم کتابوں میں بھی اگر کام کی باتیں تلاش کرو تو بہت کم پاو گے۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں مطالعہ کرنے والوں کا کیا حال ہے۔ اسی ضمن میں ہم معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے مطالعہ پر نظر ڈالیں گے کہ ان کی آوارہ خوانی کے کیا اسباب ہیں اور انہیں کن ترغیبات و موافعات سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایک شخص جب کسی کتب خانے یا دارالافتاء میں نیا نیا داخل ہوتا ہے اور کتابیں شیشے کی الہابوں میں قرینے سے رکھی اخبارات و رسائل ترتیب سے میزوں پر لگے ہوئے دیکھتا ہے تو فوراً پہلے ایک رسالہ کو ہاتھ میں لے کر چند ملت ادھر ادھر کی چار سطریں پڑھتا ہے اس کے بعد کسی دوسرے اخبار کی طرف نظر پلٹتی تو اس کی سرخیاں دیکھنا شروع کر دیں۔ اس سے طبیعت التائی تو کسی مصور رسالے کی دلکش تصاویر پر نظر جا پڑی کچھ دیر تک صانع کردگار کی خوش آفرینی کی داد دی یا فوٹو گرافر کی چابکدستی پر زبانی حال سے بیساختہ واہ واہ نکل گئی۔ اب اپنی جگہ سے اُٹھ کر کتابوں کی الہابیوں پر نظر ڈالی جو کتاب سب سے زیادہ خوبصورت اور سنہری جلد کی معلوم ہوئی اس کو

نکلوا کر چند اوراق اللّٰہ پلٹے اور اگر اتفاق سے وہ کتاب کسی ایسے فن کی نکلی جس سے ہمارے قاری کو کوئی مس نہیں تو فوراً الگ رکھ دی۔ اب جو دل گھبرا یا تو کتاب حاضری پر اپنے دستخط ثبت کر کے خواہ مخواہ لہو لگا کے شہیدوں میں داخل ہو گئے اور مطالعہ کرنے والوں کی فہرست میں ایک نام کا اضافہ کر دیا۔ پس سارے مطالعہ کی کل یہ کائنات تھی۔ یہ تو بیپچارہ پھر کچھ غنیمت تھا۔ بعض حضرات تو صرف استہارات پر ایک نظر تالکر ہی بلا کسی مضمون کی چند سطور کو تکلیف دئے ہوئے واپس ہو جاتے ہیں۔ یہ روز مرہ کا مشامدہ ہے۔

آوارہ خواں کی اسی نفسی کیفیت کا مطالعہ کر کے مسیحی مشنریوں نے بائبل کی اشاعت میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے۔ مختصر سنہری جلد کی کتب چھاپ کر لوگوں کی توجہ کو منعطف کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ فن اشتہار بازی میں بھی اس سے کام لیا گیا ہے کہ ناظر کو خواہ مخواہ اس کے پڑھنے کی ترغیب ہو۔ ایک دوسری نفسی حالت بھی قابل غور ہے کہ خوبصورت اور خوش خط چھپی ہوئی کتاب ناظر کو مرعوب کر لیتی ہے اور عموماً لوگ ہر چھپی ہوئی کتاب کو صحیح سمجھتے ہیں خواہ اس میں رطب و یابس ہو۔ اول سے آخر تک اس کو پڑھنا اپنی ناموری خیال کرتے اور قاضی کی لال کتاب سے زائد اس کی وقعت سمجھتے ہیں۔ اکثر عوام جب کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں اگر کسی نے اس میں کچھ شک کیا تو فوراً جواب دیتے ہیں یہ تو کتاب میں

بھی چھپ گیا ہے۔ اس سے زائد معتبر ہونے کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ تو عوام ہیں آج کل کے تعلیم یافتہ حضرات تو جب تک کوئی واقعہ اخبارات میں نہیں پڑے لیتے انہیں یقین ہی نہیں آتا اور ریوٹر ایجنسی کی خبروں کو وحی آسمانی سے کم خیال نہیں کرتے جس پر حضرت اکبر مرحوم کو یہ کہنا پڑا: ع:

پانیر لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے

ملتن کہتا ہے کہ اچھی کتاب کا گلا گھوٹنا بالکل ایسا ہے جیسے کسی انسان کا گلا گھوٹنا۔ کیوں کہ فضولیات کے پڑھنے سے اچھی کتابیں مردوں کے برابر ہو جاتی ہیں، دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو باقاعدہ مطالعہ کرتے ہوں اور درجہ اعلیٰ کی کتب پڑھتے ہوں ورنہ عام طور سے یہی دیکھا جاتا ہے کہ جب ہم کسی سے کوئی سوال کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں وہ پہلے سے موجود ہوتا ہے لیکن جب ہم کتاب کو اُتھاتے ہیں تو بالکل خالی الذہن ہو کر حقیقی مطالعہ میں سب سے اول کوئی نہ کوئی سوال یا مسئلہ پیش از پیش دماغ میں ہونا چاہئے اور اس کا جواب اس سے ایذا چاہئے ورنہ بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہوگا اور ہر مطالعہ کسی نہ کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر ہو تو البتہ مفید ہے ورنہ محض تضحیقات۔ بعض کتب ایسی ہوتی ہیں جنہیں ربط و تسلسل کے لئے اُن سے آخر تک پڑھنا پڑتا ہے لیکن اکثر کتب تو صرف جستہ جستہ پڑھنے کے لئے ہیں کیوں کہ دنیا کی مشغولیتیں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ ہر کتاب کو پوری طرح

رَپَہنَا نا مہکن ہو گیا ہے۔۔

اب ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ عام طور پر لوگ اس زمانہ میں کیا پڑھتے ہیں۔ سب سے زیادہ اس وقت جو کتب پڑھی جاتی ہیں وہ صرف ناول ہیں۔ یہ لٹریچر ملک میں جس وقت سے شائع ہوا ہے نوجوانوں کا بہت سا وقت ضائع کرا دیتا ہے اور بعض نواآموز طالب علموں کو اس نے دین و دنیا کہیں کا نہ رکھا۔ ملک کا ایک بڑا طبقہ ابوالعلائی پریس اور مہادیو پرشاد ورما کا مرہون منت ہے کہ انہوں نے یہ حشرات الارض جس کے لئے بارش بھی لازمی نہیں اس قدر افراط سے پیدا کر دیا ہے اور جس سے فضا اس قدر متاثر ہو گئی ہے کہ کسی اور شے کے لئے گنجائش بہت کم رہ گئی ہے۔ ہر ریل کا مسافر اشتیاشن پر دو ایک کتابیں ضرور خرید لیتا ہے کہ سفر آسانی کے ساتھ طے ہو جاوے۔ دوسرا نمبر اخبارات کا ہے چوں کہ زمانہ جنگ سے و نیز اہل ملک کی عام سیاسی بیداری کی بدولت ان کے پڑھنے والے بکثرت پیدا ہو گئے ہیں اور گذشتہ جنگ کے ایام میں تو جہلا بھی ایک پیسہ کا اخبار خرید کر ہر کسی آئندہ روز خزانہ شخص سے اس کو پڑھوا کر ضرور سنتے تھے اور ریوٹر کے تاروں پر بحث و تنقید کرتے تھے اور جرمن کی شکست کی خبریں خلاف توقع پا کر انکا یقین نہ کرتے تھے اور بعض تو بڑے بڑے اہم مسائل پر نہایت متانت سے گفتگو کرتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ ہمارے نوجوان فیشن ابل جب کوئی ریل کا سفر کرتے ہیں تو درجہ سوم کے گنواروں کو مرعوب کرنے کے لئے جہاں کوت

پتلون کے ساتھ ہیٹ لگانا ضروری خیال کرتے ہیں تا کہ آرام سے بیٹھنے کی جگہ مل جائے وہاں ایک انگریزی اخبار بھی خریدنا لازم ہوتا ہے خواہ اس زبان کے حرف شناس بھی نہوں - ایک مرتبہ ایک صاحب کا ریل میں ساتھ ہوا جو اسی طرح انگریزی اخبار سے خبریں پڑھ کر دھکا دیوں کو سنارھے تھے - غور کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت اخبار کو الٹائے ہوئے تھے اور ساری من گھڑت باتیں سنار داں حاصل کر رہے تھے - جب ان کو معلوم ہوا کہ اس درجہ میں کچھ انگریزی داں بھی موجود ہیں تو نادام ہو کر اگلے اسٹیشن سے دوسرے درجہ میں چلے گئے - کلبوں میں بھی کبھی کبھی ایسے لوگ نظر آجایا کرتے ہیں - اسی سلسلہ میں ایک واقعہ اور بھی قابل ذکر ہے ہمارے ملک کے مشہور ناراست مورخ ایک مرتبہ اپنے سفر یورپ کے حالات بیان کر رہے تھے اور انگلستان کے امرا کے ذکر میں انہوں نے فرمایا کہ وہاں کے دولتمند بھی بعض معاملات میں ہمارے ہندوستانی روسا سے کم احدی نہیں ہوتے یہاں تک کہ خود اخبار بھی پڑھنے کی تکلیف گوارا نہیں کر سکتے البتہ ان کے منشی کبھی آکر اخبارات کے کچھ مضامین پڑھ کر سنا دیا کرتے ہیں - انہوں نے زیادہ سے زیادہ اگر کیا تو مصور رسالوں کی تصاویر پر ایک دزدیدہ نظر ڈال لی - ان لوگوں کو اگر ہندوستان کی وایسرائٹلٹی بھی عطا کی جاوے تو بھی شاید اس قدر زحمت سفر وہ گوارا نہ کریں -

اب رسائل کے مطالعہ کرنے والوں کی طرف توجہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر رسالہ کو اس کی شکایت ہے کہ ملک

میں اس جنس گراں کا کوئی خریدار نہیں۔ اس لئے عدم دستیابی یا کمیابی قدر دانان کی بدولت یا ملک کے تعلیم یافتہ گروہ کے تغافل کے صدقے میں کچھہ دنوں زندہ رہکر ہمیشہ کے لئے سو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ ایک حد تک صرف غفلت اور جھوٹ ہی نہیں ہے بلکہ انکا لغو اور فضول لٹریچر اور بازاری مضامین بھی بڑی حد تک ذمہ دار ہیں جن کا نہ پڑھنا ہی بہتر ہے۔ لیکن دوسرے طرے پر جب ہم ایسے اعلیٰ پایہ کے رسائل پر نظر ڈالتے ہیں۔ جیسے معارف یا اُردو ہیں اور ان کے قدر شناس بھی کافی نہیں پاتے تو معاً یہ خیال آجاتا ہے کہ ملک میں ابھی ذوق صحیح اور طبع سلیم کی شاید صرف ابتدا ہوئی ہے۔

مگر اب حالات بدل رہے ہیں۔ انگریزی تعلیم کی بدولت اعلیٰ قسم کا لٹریچر ملک میں پیدا کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں اور نوجوان تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک بڑا گروہ مطالعہ میں انہماک و طلب صادق کے آثار ظاہر کر رہا ہے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ صحیح رہنمائی کیجائے تاکہ انتخاب کتب میں ان کو آسانی ہو اور ادنیٰ قسم کے لٹریچر سے بچ سکیں۔ ملتان نے کہا ہے کہ عہدہ کتاب حیات جاردانی ہے اور یہ قول بالکل سچ ہے کیونکہ وہ خود بھی زندہ ہے اور اپنے پڑھنے والے کو بھی زندہ رکھتی ہے۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد کافی ہے جو کسی کتاب کو پڑھکر اپنے خیالات کو ہیجان میں لائے اور بڑے رفتار میں بن گئے۔ مطالعہ کتب کی بدولت ہی

بکثرت اشخاص نے اپنے لئے نئی شاہ راہیں نکالیں —

ہماری اُردو زبان بھی اب بہترین ادب نگار پیدا کر رہی ہے۔ ادب لطیف کے بجائے جہلہ فنون میں کتب ذریعہ تراجم و تالیف کتب مہیا کی جا رہی ہیں۔ ہماری عثمانیہ یونیورسٹی اور اس کے ساتھ دارالترجمہ نے ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے۔ ایک طرف اگر دارالہنرفین علوم مشرقی کو اُردو کا لباس پہنا رہا ہے تو دوسری طرف انجمن ترقی اُردو فنون مغربی کو دیسی لباس میں ملبوس دیکھنا چاہتی ہے۔ سارے ملک میں عموماً اب آثار ترقی ہو رہی ہیں۔ اب مفید کتب اور قابل مطالعہ تحریرات کی کمی دور ہو رہی ہے۔ اگرچہ ابھی اُردو کو اپنی ہمسایہ زبانوں میں بنگالی - مرہٹی اور گجراتی کا درجہ ملنے میں ذرا دیر ہے لیکن بد تعبیل اس کی طرف قدم زنی جاری ہے۔ سب سے بڑی ضرورت اس وقت اُردو افسانہ نگاری کی ہے جس کا احساس ترقی پر ہے۔ اور وہ دن دور نہیں کہ جب یہ مشکل بھی حل ہو جائیگی۔ مختلف علوم و فنون کے ادیب اب باسانی مل سکتے ہیں۔ بیسویں صدی میں جس قدر اُردو نے ترقی کی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ باقی ساری عمر میں جو کچھ سرمایہ مہیا کیا گیا تھا وہ صرف شعرا کے ضخیم دیوانوں یا بڑے افسانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن اب بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ملک کی نئی پود کو راستہ دکھانے کے لئے مشعل برداری کی خدمت کون انجام دے گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ

ہماری خوش قسمتی سے اس زمانے میں ایسے بزرگان قوم کی ایک کافی تعداد موجود ہے جنہوں نے اپنی ساری عمر مطالعہ میں صرف کر دی ہے اور ایک بڑا زمانہ گزارنے کے بعد صرف یہ معلوم کر سکے کہ عمر کا ایک بڑا حصہ آوارہ خوانی میں گزرا اور سوائے بیکار و فضول کتب کے بہت کم مفید مطالعہ ہوسکا گویا یہ حصہ عمر ضائع ہوا اور لایعنی باتوں میں بسر ہوا اور جب تجربہ نے شاہراہ مقصود دکھلائی تو عمر آخر ہو چکی تھی اب سوائے حسرت و افسوس کے کیا رکھا تھا - جن مواعیات یا ترغیبات کا اُن کو سامنا ہوا وہی ہر نوجوان کو ابتداء میں پیش آیا کرتے ہیں - اور ایک بڑے مرحلہ کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ مفید کیا ہے اور غیر ضروری کونسا - ان اشخاص میں ایک تعداد ایسی بھی ہے کہ جنہوں نے کسی مدرسے یا یونیورسٹی میں تعلیم نہیں پائی تھی بلکہ اپنے ذوق سلیم کی بدولت بڑے مشاہیر ادیب یا مصنف بن گئے - مگر یہ بالکل مستثنیٰ لوگ ہیں انکی تقلید ہر کسی کے لئے قابل عمل نہیں - زمانہ قدیم میں ایسے غیر معمولی دل و دماغ کے عالم و فضلا گذرے ہیں کہ ان کے مطالعے کا شوق جب ہم سنتے ہیں تو ہمیشہ یقین آتا ہے انکی تصنیفات کی ضخامت کو دیکھ کر معاً یہ خیال ہوتا ہے کہ دوسرا شخص اسقدر عرصہ میں شاید محض کتابت بھی نہ کر سکیگا - لیکن افسوس ہے کہ ان بڑے اشخاص کے کارناموں سے ہمیں ہر گز یہ پتہ نہیں چلتا کہ انکا طریق مطالعہ کیا تھا - بعض کی نسبت تو یہ معلوم ہوا کہ وہ کتاب کو تین بار سے کم نہیں پڑھتے تھے اور بعض خاص باتوں کو ذوت کر

کے یاد کرتے تھے —

اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی شخص جو فہالان ملک کو فہایت صحیح مشورہ دے سکے سب سے پہلے یہ حل کرے کہ جب کوئی طالب علم پڑھنے لکھنے کی معمولی استعداد پیدا کر چکے تو اس کے بعد آئندہ کن اصولوں پر اپنے مزید معلومات کی بنیاد رکھے اور بے راہ چل کر بھٹکتا نہ پھرے۔ نہ وقت ضائع کرے اور نہ بے راہ روی سے غلط نتائج تک پہنچے بلکہ منزل مقصود اس کو سامنے دکھلائی دے جس کے شوق میں راہ کی دشواریاں اس کی ہمت نہ پست کر دیں۔ یعنی مضامین کتب کو کم وقت میں بالاستیعاب حاصل کر سکے۔ میرے خیال میں سب سے پہلے ہماری زبان میں انگریزی کتب کی طرح Index یعنی اشارہ نما لگائے جاویں اور فہرست مطالب مبسوط اور مفصل ہونی چاہئے اس کے علاوہ عنوان بندی سے بھی زائد کلم لیا جائے۔ اس صورت میں ہر شخص جس خاص شے کو معلوم کرنا چاہتا ہے اس کی تلاش میں اس کو وقت نہ ہوگی اور ساری کتاب کی ورق گردانی سے بچ جائیگا۔ دوسری شے جو بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہماری زبان میں بھی آسامی کتب یعنی Bibliography کے فن پر کتب تیار کی جائیں جس سے یہ تو معلوم ہو سکے کہ کس فن میں کون سی کتب موجود ہیں یا کسی خاص موضوع پر اہم تصانیف کتنی اکھی جا چکی ہیں۔ عربی زبان میں ابن ندیم کی الفہرست ہے جس میں کتب خانہ خدیو کے متعلق مکمل حالات موجود ہیں انگریزی میں ایسی کتابیں بکثرت ہیں۔ حال میں دارالمصنفین اعظم گدہ کی طرف سے ایک مختصر

فہرست شائع ہوئی ہے لیکن وہ ابھی بالکل نا کافی ہے۔ ایسی فہرستوں کی تیاری کے بعد جہلہ مصنفین، ان کے مختصر حالات، ان کی کتب کے مضامین کا خلاصہ، اگر یکجا ہو جائے تو مطالعہ کے فن میں بڑی حد تک رہنمائی کریگا۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا کی طرح اگر کوئی کتاب اردو میں ہو تو مختلف عازم کے بہترین مضامین اعلیٰ پایہ کے مصنفین کے لکھے ہوئے یکجا مل سکیں گے اور ہر شخص کو کسی خاص نوعیت یا فن کے مضامین میں کما حقہ و بلا زیادہ زحمت اٹھائے واقفیت حاصل ہو سکیگی لیکن اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ کوئی شخص اس فن میں ماهر ہو جائیگا کیونکہ اگر کوئی شخص کسی تـکـشـنـری کو حفظ یاد بھی کرے تو بھی اسے زبان نہیں آسکتی جب تک ادب کا تفصیلی مطالعہ نہ کرے۔

اس زمانے کی تصنیفات بکثرت اسی مل سکتی ہیں جو ہزاروں کتب کا عطر منجھو عہ ہوتی ہیں اور انسان ان سے اپنا دل و دماغ معطر کر سکتا ہے اور ایک کثیر مطالعہ اور تـضـیـع اوقات سے بچ سکتا ہے۔ اور اب روز بروز اس طرف میلان بڑھتا جاتا ہے کہ جہلہ علوم کو سائنس بنا دیا جائے۔ اس زمانے کی ایجادات نے بعد زمان و مکان کو بے حد گھٹا دیا ہے اور آدمی اب بجائے تو کارزمین رانکو ساختی کے فضا میں آسمان پر داخل کر رہا ہے۔ محنت بچانے والی کلیں اپنا کام کر رہی ہیں۔ اس لئے اس بات کا بھی اب امکان ہو گیا ہے کہ ایسے طریقہ بھی ایجاد ہو جائیں گے جن کی مدد سے کوئی شخص بہت کم وقت میں زائد مطالعہ کر سکے اور عرصہ قلیل

میں جہلہ علوم کو حاصل کر سکے۔ فی الحال یورپ و امریکہ میں مطالعہ کے طریقوں کی تحقیقات ہر رہی ہے اور ان مہانک کے جیسے ترقی یافتہ لڑگوں کا حال یہ ہے کہ ان میں ہمشکل فی ہزار ۱۳۲- ایسے نکلتے ہیں جو کسی کتاب کی کوئی خاص بحث دھرنہ نہ کر نکال سکیں اور اسے پڑھ سکیں۔ چہ جائیکہ ہمارا ملک جہاں فی ہزار ایک کی نسبت بھی مشکل معلوم ہوتی ہے اس لیے یہاں کے لیے۔ سر دست تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنی عمر میں بکثرت علوم و فنون کو حاصل نہیں کرسکتا اس لیے اس کو کسی ایک کا ہر رہنا چاہئے اور ایک فنی ہو کر اس میں کامل ہونا ممکن ہے۔ لیکن شاید یہ کہا جائے کہ اس صورت میں یہ شخص عام معلومات میں ناقص رہ جائیگا۔ اور مضمون کی یکسانیت زندگی کو اجیرن کر دیگی کیونکہ فطرت انسانی عموماً تذرع پسند ہے اس کا مطالب یہ ہرگز نہیں ہے کہ دنیا کے دیگر فنون میں اس کو ابجد خوانی بھی نہیں کرنی چاہئے البتہ یہ ضرور ہے کہ تخصیص صورت ایک ہی میں ہونا چاہئے۔

آوارہ خزان کی زندگی ایک بھونرے یا تیتوری کی سی ہے جو ہر پھل کی لذت اٹھاتے ہیں لیکن کچھ اندر ختم نہیں کرتے یا مثل جہینگر کے ہے جو ساری کتابیں چات کر بھی عالم نہیں بنتے مگر باقاعدہ مطالعہ کرنے والا شہد کی مکہ کی طرح ہے جو مختلف پھولوں سے عرق لے کر ان کو ترکیب دیتی اور ایسی نفیس شے تیار کرتی ہے جس سے خود بھی متہتج ہو اور خلقت کو بھی فائدہ پہونچائے۔ یعنی اس کو دے ماکدر اور

خدا صفا پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔

اب رہی اس کی دوسری صنف کہ پڑھنا کیونکر چاہئے۔ اس کے جواب کے لیے زمانہ موجودہ میں جو اصول و قواعد تعلیم یورپ و امریکہ میں عالم النفس کی مدد سے ترتیب دیے گئے ہیں ان کے لحاظ سے وقت کی دو تہاں حصے کی بچت ہو جاتی ہے۔ پیہائش ذہن کا طریقہ بھی نہایت درجہ مفید ثابت ہو کر رواج پذیر ہو رہا ہے۔ اس صورت میں دماغ پر بلا مزید بار ڈالے ہوئے بہت کچھ دل پر نقش کیا جاسکتا ہے۔ مطالعہ کے لیے سب سے اول اطمینان خاطر ہونا چاہئے اور جگہ جہاں انسان بیتھکر کتاب دیکھے پر سکون ہونا چاہئے نشست ایسی ہو جس سے سارے حواس کام کر سکیں اور بدن میں مستعدی پائی جاوے۔ کتاب کہولتے ہی یہ سوال کر لیا جاوے کہ کیا معلومات حاصل کرنا ہیں پہلے ابواب و مضامین کی سرخیوں پر نظر پڑے۔ یعنی اندکس کو دیکھنا چاہئے بعد ازاں صورت اپنے مفید مطلب حصوں کو پڑھنا چاہئے۔ کتاب شروع کر کے جلد جلد پڑھی جاوے۔ درمیان میں پنسل سے خاص مواقع پر نشانات کر لئے جاویں یا الگ نوٹ کر لیا جاوے۔ تو اس صورت میں ساری کتاب اپنی ہوجائیگی۔ قراءت میں بعض کی رائے ہے کہ آہستہ پڑھنا چاہئے لیکن بعض آواز سے پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ صورت اول میں صوت قوت باصرہ پر اثر پڑتا ہے اور دوسری صورت میں سامعہ و باصرہ دونوں اپنا کام کرتے ہیں۔ ترکیب اول سے وقت کی کفایت اور ترکیب دوم میں دل دماغ پر گہرے نقوش پڑتے ہیں۔ آرام طلبی کے

ساتھ لیت کر پڑھنا بالکل غیر مفید ہے اور بعض لوگ جو سوتے وقت کتاب ہاتھ میں لیتے ہیں اس سے ان کا مقصد صرف نیند لانا ہوتا ہے پڑھنے سے اس کو سروکار نہیں۔ اس صورت میں خیالات کی یکسوئی سے جلد نیند آ جاتی ہے اور کتاب ہاتھوں سے چھوٹ کر الگ جا گرتی ہے۔ یہ بھی آوارہ خوانی کی سرگذشت جو اوپر بیان ہوئی آئندہ چلکر شاید نفسیات کی رو سے کچھ مزید روشنی ڈالی جا سکے —



”ارضِ دکن سے خطاب“

(از جناب عبدالقدیر صاحب قدیر اورنگ آبادی)

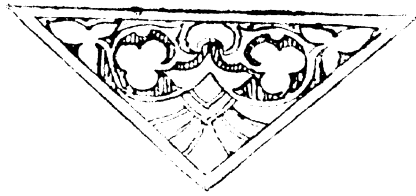
اے دکن کی سوز میں اے مایہ دار جامعہ
تیری ہستی سے ہے وابستہ وقار جامعہ
دیدنی ہے منظر صبح بہار، جامعہ
ہوں مبارک تجھ کو یہ لیل و نہار جامعہ
حبذا کیا تیری فطرت آسماں پر واز ہے
آج کل ہر فرد تیرا، گوش بر آواز ہے
سدتوں تیری فضا آلودہ ظلمت رہی
اور مہنوں تساہل تیری کیفیت رہی
تیری دنیا آج تک آسودہ غفلت رہی
با وجود افکار تازہ خوگر راحت رہی
ہاں! مگر اب آج کل شیرازہ حکمت ہے تو
ہے تو کہنے کو زمیں پر مائل رفعت ہے تو
روغن اندازی کی تو نے شمع دان علم میں
اور جنبش دال دی کیا کاروان علم میں
ہے کہاں مد مقابل تیرا شان علم میں
امتیاز حاصل ہے تجھ کو اب جہاں علم میں

تو نے بزمِ جامعہ کچھہ اسطرح آباد کی
یاد تازہ ہو گئی، غر ناطہ و بغداد کی،
دور حاضر میں ہے تو گہوارۂ علم و ہنر
تیرا مستقبل نظر آتا ہے خوش آئیندہ تر

آبیاری ادب پر تو نے جو باندھی کھر
تیری ہم سایہ زمینوں پر بھی ہے اُس کا اثر
ہر ادائے دانشین تیری ادب آموز ہے
ہر نفس تیری فضا کا، انجمن افروز ہے
شاہد اُردو نے، کہتے ہیں، لیا تجھہ میں جنم
اس لئے ہے اُس کے سر پر تیرا دامنِ کرم

پرورش تو کر رہی ہے اُس کی باناز و نعم
پایا ہے تیری بدولت اُس نے یہ عز و حشم
ہر نظر اُردو کے حق میں تیری لطف آمیز ہے
بادۂ ایثار سے ساغرِ ترا لبریز ہے
تیرے فرزندوں کی گر پیہم یہی کاوش رہی
اور یہی اک آرزو سرمایۂ نازش رہی
یو نہی مہسرِ علم کی ان پر اگر تابش رہی
اور درس ارتقا ہی کی انہیں خواہش رہی
پھر تو ہو جائیگی تو رشک کھال مغربی
تجھہ سے قایم ہو گئی مشرق میں مثال مغربی
تیری ہستی فاروا، کیوں! مورد الزام ہے
ساری آبادی کو جب کہ ایک ہی پیغام ہے

تو بلا تغریق ملت ، چشمہ اقوام ہے
 گہات سے سیراب تیرے آج خاص و عام ہے
 تیرے دامن میں پہلے پہو لے ترا دارالعلوم
 ہوں کرم فرما زیادہ تجھ پہ سلطان العلوم



واہمہ کی نیرنگیاں

اگر کوئی شخص اسراض دماغ کے دوا خافوں یا پاگل خافوں میں جاے تو اُسے بہت جلد یہ محسوس ہو جاے گا کہ بیماروں میں گونا گوں واہمے اور التباسات پائے جاتے ہیں۔

اگر ان مقامات میں تم سیاح کی حیثیت سے جاؤ اور صف مجانین سے گزرو تو تمہیں کہیں تو ایسے بزرگ ملیں گے جو کہ لاکھوں روپیوں کی ملکیت کے دعویدار ہیں! کوئی صاحب سلطان روم اور شہنشاہ ہند کی خیالی مسند پر متمکن نظر آئیں گے! کوئی اپنی علمیت کے نشہ میں مست نظر آے گا اور ہزاروں زبانوں کے جاننے کا دعویٰ کریگا اور کوئی صاحب علاج معالجے میں خود کو مسیحائے دوراں خیال کرتے ہوئے! کہیں کہیں کوئی ایسا مریض نظر آے گا جس کا دعویٰ ہو گا کہ میں شیخ وفاتی اور رستم ہوں اور اگر آپ اعتراض کریں کہ وہ رستم اور ساتھ ہی شیخ وفاتی دونوں کیسے ہو سکتا ہے تو آپ کو جواب ملے گا کہ۔

”میں ایک ماں سے رستم اور دوسری سے شیخ وفاتی ہوں!“

ڈاکٹر اسٹا ٹرٹ ایک بیمار کا حال اس کی زبانی سنکر یوں لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک شریر گھوڑے نے چند بچوں کو جو سڑک پر کھیل رہے تھے اور جن میں وہ بھی شریک تھا خوت زدہ کر کے بھگا دیا۔ چالیس سال کے بعد جب اُن بچوں کی ماؤں نے اپنے اپنے بچے کو دھونڈ نکالا تو یہ ممکن تھا کہ وہ بچے آپس میں تبدیل ہو جاتے اور یہ (بیمار) منصب شہزادگی کا وارث بن جاتا! بالآخر یہ بات حسب حال صحیح ہوئی چکی۔ اب یہ شخص پاگل خانے میں ہے اور شہزادہ بننا ہوا ہے۔

اگر کوئی ایسے مریضوں کو ذرا بھی عزت و حرمت کی نگاہوں سے دیکھے تو وہ سمجھتے ہیں کہ اس کا سبب صرف اُن کی اہمیت اور عظمت ہے۔۔

ان خاص حالتوں سے قطع نظر عوارض دماغ کے دواخانوں میں اکثر یہ آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔

”میں تمام دنیا میں سب سے زیادہ متمول ہوں“

”میں طاقت و جوانمردی میں رستم زمانہ ہوں“

”میں زندہ رہنے کے قابل نہیں“

”میں مرچکا ہوں۔ میں کبھی نہیں مروں گا“

”میں نے ایک بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے“

”دنیا مرے خلاف مصروف سازش ہے“

”میں ایک بادشاہ کا بیٹا ہوں“

”میں ایک نہایت خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا

! چاہتا ہوں“

”میں حیوان مطلق ہوں!“

ممکن ہے کہ کہیں کوئی عذرت یہ شکایت کرتی ہوئی نظر آئے کہ کوئی فرضی شخص اُس کے عشق میں گرفتار ہے اُس پر ظلم کرتا ہے اور اسے اسی چیز کا سواہان ہے۔

بعض اوقات دارالہجائین میں دو رشتہ دار مریض ایسے ملیں گے کہ دونوں کی زبانوں پر ایک ہی دعوے مہمل ہو۔ لیکن ایسے واہمے اور التباسات ضرور نہیں کہ نشان جنون ہی سمجھے جائیں۔ ذی عقل انسانوں میں بھی ایسی چیزوں کا پایا جانا عجب نہیں ہے۔ اکثر لوگ مندر۔ جادو۔ گنڈا۔ اور تعویذ کے قائل ہوتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں کہ دستر خوان پر تیرہ آدمیوں کا ہونا مندرس سمجھتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے سامنے سے کسی رنگ کی بلی کا راہ کترنا برا شگون سمجھتے ہیں۔ بچوں کو پریوں کے وجود کا یقین ہوتا ہے خوبصورت گزیوں کو اپنا جیسا جیتا جاگتا خیال کرتے ہیں۔ لیکن ان باتوں سے عام رائے اُنہیں معنوں نہیں کہتی۔

پس معلوم ہوا کہ حالت جنون کی طرح حالت ہوشیاری کے بھی راہمے ہوتے ہیں۔ اور ہم کو ان دونوں میں فرق کرنا چاہئے۔ حالت ہوش کے واہمے کی یہ تعریف کی جاسکتی ہے کہ وہ ایسے خیالات ہیں کہ جنہیں اُس شخص کے جو اُنہیں باندھے (ہم فرقہ۔ ہم خیال و ہم نسل مانیں

وہ لوگ جو ”دارون“ کے قانون ارتقا کو نہیں جانتے کسی ایسے شخص کو جو ذوی الحیات کی تخلیق کی توجیہ ارتقا کی اصولوں پر کرے دیوانہ سمجھتے ہیں مگر

چونکہ وہ شخص اُن چیزوں کے غور و خوض میں اپنی عمر صرف کرتا ہے اور اس کے علاوہ ماہران علم الحیات اُس کے بیان کی صحت یا غلطی خوب جانتے ہیں اور اُس کے حامی رہتے ہیں اس لئے یہ اپنے خیال پر اصرار نہیں کرتے —

اس کے بالعکس حالت جنوں کے واہمے جس وقت سننے جاتے ہیں ویسے ہی مہمل و بے بنیاد معلوم ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی طبی نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ ان کی تہ میں دبے ہوئے جذبات اور مسدود خواہشات اپنا کام کر رہی ہیں —

چونکہ ہم جانتے ہیں کہ ایسے مجاذبین نہ صرف اپنے بلکہ سوسائٹی کے حق میں بھی مضرت رساں ہوتے اس لئے مجبور ہو کر انہیں دارالہجانبین میں داخل کر دیتے ہیں جہاں اُن کا علاج کیا جاتا ہے اور اُن کے حرکات کی نگرانی بھی خوب ہوتی ہے —

یہ لوگ توخیر مجنوں سمجھے ہی جاتے ہیں، لیکن ہمیں اُن لوگوں کو جو اپنی علوے شان پر یقین کامل رکھتے ہیں اپنے فرقہ-جہالت-یاگزشتہ کامیابیوں پر فخر کرتے ہیں اور اس پردہ میں اپنے ہمجنسوں کے ساتھ نامناسب برتاؤ کرتے ہیں کیا کہنا چاہئے؟ ضرورت ہے کہ اس سوال کا جواب صداقت اور تحقیق کے بعد دیا جائے کیونکہ ممکن ہے کہ ہم بھی ان کی طرح کے غلط خیالات میں مبتلا ہوں —

ہر شخص بہت آسانی کے ساتھ اپنے دل میں یہ خیال قائم کر لیتا ہے کہ اُس سے زیادہ نیک اور دنیا کے لئے اہم کوئی

دوسرا نہیں۔ اُس کی جماعت اور قوم عہدہ ترین ہے۔ اور اُس کا مخالف نہ صرف غلطی پر ہے بلکہ مکار اور بد معاش بھی!۔

لیکن سائنس سے ہمیں کیا معلوم ہوتا ہے؟ کائنات کی وسعت بے پایاں میں کوء زمین خود ایک ذرا نقطہ ہے۔۔۔ کسی شخص کو کسی دوسرے سے پیشتر وجود میں آئیے شرمندہ نہو نا چاہئے ۲۵۰۰۰ اور ۴۰۰۰۰ سال کے درمیان دنیا میں ایسے لوگ آئے جنہیں صحیح طور پر اشراف المخلوقات کہا جاسکتا ہے۔ اور انہیں کی نسلیں اب بحیثیت مجموعی ہو موسیپینس (Homo - sapiens) کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ اگر ہم طبعی تاریخ کا مطالعہ کریں اور انسان اور اُس کی بنائی ہوئی چیزوں کی تدریجی ترقی دیکھیں تو ہمیں اُن اجزا کا علم ہو جائیگا جنکا مرکب نتیجہ انسانی ترقی ہے۔

اقوام کی تاریخ ہمیں کیا بتلاتی ہے؟ موجودہ اقوام کے ماضی کی تاریخ میں بہت سی باتیں اُن کے لئے قابل فخر اور بہت سی موجب ننگ پائی جاتی ہیں۔ ہماری رائے ہے کہ ناظرین یچ۔ جی وبلز کی تاریخ ”دی آرٹ لائن آف ہسٹری“ کا مطالعہ ضرور کریں۔ اُس کا مصنف لکھتا ہے کہ انسانی تاریخ دراصل خیالات کی تاریخ ہے۔ جنگوں کے وقوع میں آنے سے پہلے کے انسانی خیالات کی جانچ پرتال اس سے کی جاتی ہے۔ گذشتہ چھ سال کے عرصہ میں جیسے ہوئے خیالات۔ تعصبات اور ذہنی حدود جن کی نظیر تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔

جنگ کے ساتھ ہی دنیا کے دلوں سے رخصت ہو گئے۔ یوں تو دنیا کے مسئلہ اور مفروضہ خیالات اُس کے ارتقا کے ساتھ ساتھ بدلتے آ رہے ہیں لیکن جنگ عظیم کے بعد ایسی تبدیلی کی حد ہو گئی۔ غالباً اس سے پہلے ایک ہی مقصود کے ساتھ اور ایک ہی تقدیر کے فیصہ پر رضا مند اور متفق ہو کر کبھی آدمی آپس میں مقابل نہیں ہوئے ہونگے۔ سردست ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ کتنی دنیا میں جنگ کے قبل کے خیالات بھولے گئے اور کتنی دنیا اب انہیں بھولنے لگی ہے۔ ہم میں سے بہت کم لوگوں نے اپنے خیالات کی تبدیلیوں کا اندازہ لگایا ہے۔

سب سے زیادہ استبدادی واہمے بڑی مشکل کے بعد دلوں سے مٹتے ہیں۔ (فرانس کی نسبت جس نے بے انتہا آفتیں برداشت کیں اور اپنے خیالات کا ٹھہرہ پالیا کسے خیال تھا کہ وہ پھر اُسی دماغی حالت میں مبتلا ہو کر مراکش کے بہادران ریف سے جنگ کریگا؟ —

’روح جنگ‘ (’دی سول آف دی وار‘) کا مصنف فلپ گبس اپنی کتاب میں ایک سپاہی کا قول نقل کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ ”قانون فوج کی حد ہو گئی۔ آئندہ ہمیشہ آفتوں کے دوبارہ سہنے سے آدمی انکار ہی کرتے رہیں گے۔ اگر مجھے خیال ہو کہ میرا کوئی لڑکا اُن آفتوں میں پڑے گا جو میں کچھ عرصہ سے سہہ رہا ہوں تو میں اُس کو ان سے بچانے کے لیے گلا گھونٹ کر مارتا ہوں“ لیکن ابھی جنگ کو ختم ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گذرا اور فرانس پھر جنگ میں

مصررت ہے۔ اُس سے اُن زخمہائے کاری کے خیال کو جو 'باشے' اور 'ہن' کے ہاتھوں اُس کے جسم پر لگے تھے بھلا دیا ہے۔ زور اور حکومت کے مریضوں کو جلد یا دیر کسی نہ کسی قسم کے غمناک حادثہ سے در چار ہونا پڑتا ہے —

اب چین کی موجودہ حالت پر نظر ڈالیے۔ کہا جاتا ہے کہ ہمیں اس ملک میں اپنے رعب و داب کو برقرار رکھنا چاہئے۔ جاپان۔ امریکہ اور یورپ اس بات پر تلمے ہوئے ہیں کہ معاملات چین کی غیر جانبدارانہ تحقیق کی بجائے زور و قوت کے مظاہر سے اپنی اخلاقی برتری ثابت کی جائے —

بہبئی کی موجودہ حالت ہی پر نظر ڈالو۔ وہاں آج کل گرنیوں کے مالکوں اور مزدوروں کے درمیان کشیدگی ہو گئی ہے۔ گرنیوں کے مالکوں کا اصل مدعا کسب منافع ہے۔ انہیں مزدوروں کی زندگی کی ضروریات کے متعلق کچھ فکر ہی نہیں۔ وہ صرف اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ انصاف چاہتے ہیں لیکن کیسا انصاف! وہ جو قانون رسد و طالب اور تجارت کی موجودہ نازک حالت کا لحاظ رکھے۔ غرض وہ ہر چیز کا خیال کرنے پر آمادہ ہیں۔ مگر مزدوروں کی آسائش کا مطلق لحاظ نہیں کرتے۔ اور اس پر بھی انہیں یہ دعوے ہیں اور یہ سراسر غلط خیالی پر مبنی ہے) کہ وہ انسان ہیں۔ سہذب و رحمدل ہیں۔ باتھیز شہری ہیں اور عزت و احتشام کے سزاوار ہیں —

لیکن سب سے زیادہ ہولناک اور نفرت انگیز ایک اور بات بھی ہندوستان میں پائی جاتی ہے کہ غربا کو

ان کی ذات کی وجہ سے گلی کوچوں سے گذرنے اور تالابوں اور
 کنوؤں کے آزادانہ استعمال میں لانے سے روکا جاتا ہے —
 کیا یہ تمام حرکات انسانی غلط خیالی کے نتیجے نہیں ہیں؟
 کیا واہمے کے ایسے شکار معجزوں نہیں ہوتے؟ اگر انہیں پاگل
 نہیں خیال کیا جاتا تو کیا اسلئے کہ وہ ذی عقل ہیں اور پاگل
 خانوں کے پاگلوں سے زیادہ ہوشمند؟ نہیں نہیں —
 اچھے کو برا برے کو اچھا سمجھے
 کتنی یہ بری سمجھہ ہے اچھا سمجھے!

ایسا نہیں ہے۔ ان جھوٹے دعویداران ہوش و خرد کو
 ایسے خیالات کی وجہ سے ذی فہم سمجھنا سمجھنے والوں کی
 سمجھہ کا پھیر ہے۔ والاہم مانتے ہیں کہ نہ جنوں کسی انسان کی
 عقل سے بیگانہ ہے نہ کوئی دماغ اس کے بعیز ہے مگر ہوش
 و خرد کے پردے میں پوشیدہ ہونے اور اس نفرت انگیز
 ظہور کی وجہ سے اپنی اصلی اور محدود عزت بھی کھو دینے
 کی وجہ سے کارخانہ عالم زبر و زیر ہے —

جن جن حضرات کو خاص مراعات حاصل ہیں وہ اسی لئے
 اپنی نظروں میں آپ نیک اور باخدا نظر آتے ہیں کہ وہ
 واہمے میں گرفتار ہیں۔ اس کے سوا اور کوئی دوسری
 توجیہ ممکن نہیں ہے —

اگر ہندوستان سے ایسے خیالات دور کیے جاسکتے ہیں
 تو صرف اس کے بسنے والوں کے متحدہ پاکیزہ خیالات اور
 حرکات و اعمال حسنہ سے! کیونکہ اگر ہم دنیا کی بری باتوں
 کو مٹانا چاہتے ہوں تو یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ پر

نظر تالیں اور خود اپنے التباسات کو اپنے دل و دماغ
سے یک قلم دور کریں —

[نوٹ - پاگل خانوں کے پاگل تو زیرِ معالجہ ہیں مگر
یہ مجانین ذی عقل کس مرض کی دوا ہیں؟ اگر یہ اپنا
علاج آپ کریں تو اُن کے دفاتر خیالات اُن کے لئے نسخہائے
شفا ہیں ورنہ پروانہ جات قضا ہیں! ۱۲ مترجم] —

معہد حفیظ الرحمن طالب علم میٹرک



ملک عنبر کے نوکھنڈے سے خطاب

(از جناب محمد عباس صاحب اقدس حیدرآبادی
ملشی عثمانیہ کالج اورنگ آباد)

یادگار عہد ماضی رہ گئے ہیں جو کھنڈر
اب بھی اپنی شوکت رفتہ پہ ہیں وہ نوحہ گر
خفتہ ہنگامے ہیں ان کے منظر غمناک میں
دیکھنے کو ان کی ہستی مل گئی ہے خاک میں
نوکھنڈے کے بام و در ہیں سوگوار غم بنے
ہر روش قطرات شبنم گریۂ پیہم بنے
ٹوٹی پھوٹی سی کہانیاں اور یہ طاق و رواق
کہہ رہے ہیں زایروں کو الوداع و الفراق
نقش فانی جم گیا تصویر دھندلی ہو گئی
چھا گیا ادبار تجھ پر تیری قسمت سو گئی
غلغلہ ہے یاس و حرماں کا ترے آغوش میں
ہے نہاں افسانۂ رنگیں لب خاموش میں
اب کہاں دامن میں وہ رنگینیاں گلزار کی
لوٹتی ہیں خاک پر بیلین در و دیوار کی

تیری ہستی تھی کبھی رونق فزائے کائنات
 جھللا کر بجھ گئی آخر تری شمع حیات
 سگریاں تانے ہیں جالے تیری عشرت گاہ میں
 ہیں خس و خاشاک کے انبار تیری راہ میں
 جاگتے سوتے تری بربادیوں کا غم کریں
 جی میں آتا ہے کہ ہم برسوں ترا ماتم کریں
 چشم عبرت دیکھ کر حالت تری حیران ہے
 پہلے تو آباد ہوگا آج کل ویران ہے
 رہنے والوں نے ترے دیکھی تھی شان زندگی
 راز دنیا کے بتا! اے رازدان زندگی
 ہاے وہ دن جو شبستان نور سے معمور تھا
 ہاے وہ دن جو شبستان جلوہ گاہ طور تھا
 ہن برستا تھا جہاں اب خاک اُرتی ہے وہیں
 ایسی بربادی کے افسانے ہیں عبرت آفریں
 جس محل کے رہنے والے عیش سے مافوس تھے
 جس محل کے دائیں بائیں سیکڑوں فانوس تھے
 ان کی تربت کا نشان اے دیدۂ عبرت نہ پوچھ
 اب مجھے تو چھیر کر اسلاف کی عظمت نہ پوچھ
 رہ گیا ہے جو نشان وہ خاک سے ہمدوش ہے
 ذرہ ذرہ اب یہاں کا محشر خاموش ہے



نظریۂ جبلت کی تردید

سید عسکری حسین متعلم سال دوم ایف عثمانیہ کالج
اورنگ آباد - دکن

اب تک یہ خیال رائج تھا کہ بچوں کی ذہنی ساخت کا بہت بڑا حصہ جبلی ہوتا ہے اور وہ ماں کے پیٹ ہی سے بعض صلاحیتیں لئے ہوئے پیدا ہوتے ہیں مثلاً خوف، غصہ، عجبوہ، پسندی کا میلان، تقلید کا رجحان وغیرہ، اس مضمون میں اس نظریہ کی تردید کی گئی ہے۔ یہ ناظرین کو تعجب خیز ضرور نظر آئے گی، لیکن نئی نہیں ہے۔ اس سے پیشتر بھی اٹھارویں صدی میں فرانس کے مایہ ناز فلسفی (Rosseau) نے معصومیت اطفال کا نظریہ 'Theory of the Unspoilt Child' پیش کیا تھا، جس میں اس نے یہ بتایا تھا کہ بچوں کی خرابی کی ذمہ دار ان کی فطرت، یا توریث نہیں، بلکہ صرف ماحول ہے، ہر بچہ ایک سادے کاغذ کی طرح صاف ذہن لئے ہوئے پیدا ہوتا ہے، جتنے نقش و نگار ہوتے ہیں، تعلیم و تربیت کی بدولت ہوتے ہیں، اگر یہ خیال صحیح ہے تو والدین اور مدرسین کی ذمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے - (ادیتر)

بچوں کی ابتدائی حالت پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ پیدا ہوتے ہیں تو ان میں نہ تو جذبہ محبت ہی ہوتا ہے اور نہ خوف۔ بچہ فطرتاً نہیں بلکہ سیکھ کر ماں سے محبت کرتا ہے۔ پہلے وہ ایک اجنبی سی ہوتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ یہ اجنبی پن غائب ہوتا جاتا ہے۔ کوئی بچہ پیدا اُٹھی دھتا (Right Handed) یا کھپا (Left Handed) نہیں ہوتا اور نہ وہ کسی قسم کی ذہانت وراثتاً لاتا ہے۔ اس میں کوئی ایسی شے نہیں ہوتی جس کو ہم باطنی یا ”ادنیٰ فطرت“ کے نام سے موسوم کریں۔ یہ تمام چیزیں اس کو دنیا میں آنے کے بعد حاصل ہوتی ہیں۔ یہ اکتسابی ہوتی ہیں۔ جس چیز کو عرت عام میں ”انسانی فطرت“ کہا جاتا ہے اور جس کے متعلق خیال ہے کہ وہ پیدا اُٹھی ہوتی ہے جس کے پردے میں ہم اپنی خامیوں اور غلطیوں کو بشریت کہہ کر چھپاتے ہیں وہ ایک لغو خیال ہے۔ ایک نو زائیدہ بچہ ان تمام چیزوں سے مبرا ہوتا ہے۔ غلطی تقاصے بشریت نہیں ہے۔ ”الانسان مرکب من الخطا و انسیان سے یہ مراد لینا غلطی ہے۔“

ڈاکٹر واٹسن (Watsan) نے ایک ہزار سے زائد بچوں کا مشاہدہ کیا ہے اور جو نتیجہ اس سے برآمد ہوا وہ نہایت ہی تعجب خیز ہے۔ لیکن اس نتیجہ سے بھی زیادہ تعجب کے قابل بات یہ ہے کہ اب تک علمائے سائنس کا ذہن اس طرف کیوں منتقل نہیں ہوا۔

ڈاکٹر واٹسن کا دعویٰ ہے کہ اس قسم کی کوئی شہادت نہیں مل سکتی جو نفسیت دانوں کے اس خیال کو صحیح

ثابت کرے کہ آدمی میں جذبات خوف (عرفی اشکال محبت رشک و رقابت، جنگ جوئی، غصہ و ناخوشی، رحم، تجسس، کسی شے پر تصرف، اخذیت، * مرض سرکہ Kleptomania / کھیل- تیزی، تعامل، شرم و حیا، صفائی، تہذیب اور والدین کی محبت وغیرہ پیداؤشی طور پر موجود ہوتی ہے۔ تجربہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام چیزیں اکتسابی ہوتی ہیں نہ کہ فطری۔ مختصر یہ کہ کوئی بچہ شعور، کیفیات ذہنی، مرکبات ذہنی (Complexes) تخیل، ارادہ وغیرہ ساتھ لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تمام خیال ہی خیال ہے۔

رنگ

کوئی بچہ بھی کسی خاص قسم کی ذہانت لیکر پیدا نہیں ہوتا۔ ذہانت کا خیال ہم کو صرف دماغ ہی کے حوالہ سے نہیں کرنا چاہئے۔ سوچنے کا تعلق تمام جسم سے ہے اور خاص طور پر خنجرہ سے۔ کوئی ایسا اصول ہمارے پاس نہیں ہے جو یہ ثابت کر دے کہ سفید رنگ کے بچے شعور میں کالے، پیلے، بھورے رنگ رکھنے والے بچوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ اور نہ کوئی اصول ایسا ہی ہے جو اس بات کی شہادت دے کہ جو بچے دن مارک

* بعض لوگوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ باوجود والدین ہونے کے ان میں ایک قسم کی چوری کی عادت ہوتی ہے کہیں نہ کہیں سے کچھ نہ کچھ چھپا کر جیب میں ڈال لیتے ہیں۔ خواہ وہ توتے ہوئے چینی کے تکرے ہی کیوں نہ ہوں۔

اور تاروے کے والدین سے پیدا ہوتے ہیں وہ جیگو سلاو-
 سامی، اور یونانی بچوں سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔
 جیسا کہ ڈاکٹر واٹسن کہتے ہیں کہ جب کسی عہر کے
 بچہ کو (جسکی پرورش صحیح اصولوں پر کی گئی ہو)
 سانپ، مچھلی، اندھیرا، جلتا ہوا کاغذ، بلی، کتا، پرنده
 بندر اور اس قسم کے دوسرے تہیجات سے متہیج کرو تو
 اس قسم کا ہیجان کبھی نہ پیدا ہوگا جس کو عرف
 عام میں ہم خوت سے منسوب کرتے ہیں اور جو سانس
 کارکنا، چیز کی طرف سے پلٹنا، دورنا، رینگنا، وغیرہ
 کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ خوت میں مدد کرنے
 والی صرف دو چیزیں ہیں ایک زور کی آواز اور دوسرا
 سہارے کا باقی نہ رہنا۔ یہ تہام تہیجات جو ہم کو کسی شے سے باز
 رکھتے ہیں جیسے پیچھے ہٹنا کسی شے کی طرف سے پلٹنا وغیرہ
 سب سیکھے ہوئے ہوتے ہیں —

مذکورہ بالا بیان ایک روشن شمع کے تجربہ سے اچھی
 طرح واضح ہو جائیگا۔ رکھی ہوئی مٹھائی پر ہاتھ ڈالنے
 اور شمع کی لو سے ہاتھ کھینچنے میں جو حرکتیں ہوتی
 ہیں وہ ایک ساتھ قائم کی جاتی ہیں۔ اگر بچہ کی آنکھوں
 کے سامنے شمع لائی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہی اشتیاق
 کے حرکات جو مٹھائی کے وقت سرزد ہوئے تھے شمع کو دیکھ کر
 بھی ہو رہے ہیں۔ شمع کو بچے کے سامنے لیجاتے ہوئے
 اس کا خیال رہے کہ بچہ کے اتنی قریب نہ لیجائی جائے کہ
 وہ اپنے ہاتھ کو جلا لے لیکن اتنا قریب ہونا اس کا ضروری

ہے کہ بچہ ہر کوشش میں اپنے ہاتھ کو لو کے قریب لاسکے۔ اس سے یہ تہیجیات پیدا ہونگے۔ کسی قدر ہاتھ کی انگلیوں کا بند کرنا، جلدی سے انگلیوں کو بند کرنا۔ انگلیوں کو کھول دینا۔ ہاتھ کا پھیلانا اور اگر حدت بہت ہی زیادہ ہو تو بازو کھینچ لیا جاتا ہے۔ یہ جملہ حرکات بالکل مٹھائی والی حرکات کی طرح ہوتی ہیں۔

جب بچہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی دفعہ اپنا ہاتھ جلا لیتا ہے تب کہیں اسے اس کا تجربہ ہوتا ہے کہ لو سے ہاتھ مس نہ کیا جائے یہ بھی ممکن ہے کہ چند شدید چرکے ہی اس کو تجربہ کرا دیں اور زیادہ کی اس کو ضرورت نہ ہو۔ اس مثال سے ہم کو بچہ کے جبلی جوابی حرکات کا علم ہوتا ہے اور یہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ خاص خاص چیزوں کا خوف بچوں میں اکتسابی ہوتا ہے۔

ہاتھ بڑھانے کی جبلی عادت

ایک سو پچاس دن کے بچہ سے لیکر ایک سال عمر والے بچہ پر اضطراری گرفت کے متعلق تجربہ کیا گیا تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ پہلے کو نسا ہاتھ چیزوں کے طرف بڑھایا جاتا ہے۔ اس کے واسطے ایک پیپر منت کی چسنی یا شمع استعمال کی گئی۔ ان میں سے ایک چیز اس کے چہرے کے سامنے آہستہ آہستہ لائی گئی تو ہاتھ بڑھایا گیا۔ ایک اور شخص اس تجربہ کے دوران میں یہ نوٹ کرتا رہا کہ کو نسا ہاتھ پہلے استعمال ہوتا ہے اور اگر دونوں ہاتھ استعمال ہوئے جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو پہلے کو نسا ہاتھ سے چیز کو مس کیا گیا۔ ان آزمائشوں سے

معلوم ہوا کہ یہ خیال کہ ایک ہاتھ ہی زیادہ تر استعمال کیا جاتا ہے صحیح نہیں ہے۔ گرفت میں دھننے - بائیں ہاتھ کی کوئی قید نہیں ہے —

چار ماہ سے ایک سال تک کی عمر والے ایسے بچوں کا امتحان بھی کیا گیا جنہوں نے اب تک کوئی جانور دیکھا ہی نہ تھا —

ایسے امتحان کے لئے بچوں کو ماں یا کھلائی کی گود میں بٹھا دیا گیا اور جیسے ہی وہ چپ ہو گئے اچانک ان کے سامنے ایک زندہ جانور چھوڑ دیا گیا —

ٹی (T) (جو ۱۹۵۸ء دن کی لڑکی تھی) اس کے سامنے ایک سیاہ پالو بلی کو چھوڑا گیا اور اس بلی کو بچی کے قریب آنے دیا گیا۔ بچی اس کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا کر جھپٹی، اس نے پہلے اس کی ناک کو چھوا اور پھر اس کے پنجوں سے کھیلنے لگی —

تا اکثر واقعات کا بیان ہے کہ کسی تجربہ میں کسی بچہ میں بھی کسی قسم کا فطری خوف نہیں پایا گیا —



مہارت و نمائش

(از افضل حسین فاروقی معلم نظام کالج - حیدرآباد)

شاہان یورپ نے یہ ایک طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ ان کی رعایا میں سے جو شخص مستوجب اکرام ہوتا ہے اسے دو گز فیلا فیتہ تحفتاً دیدیتے ہیں جسے پانے والا اپنے سینہ پر لگاتا ہے۔ جن لوگوں کی اس طور پر عزت افزائی کی جاتی ہے وہ ”بہادر“ کے لقب سے موسوم کئے جاتے ہیں اور خود بادشاہ ایسے گروہوں کے سردار ہوا کرتے ہیں۔ اہم خدمات کا اس طرح صلہ دینا بڑی کفایت شعاری ہے۔ بادشاہ بڑے خزانے نصیب ہیں کہ ان کی رعایا ایسے حقیر انعام سے مطمئن ہو جاتی ہے۔ اگر کسی امیر کی کسی لڑائی میں قاتل ضائع ہو جائے تو بادشاہ دو گز فیتہ اُسے دیدیتا ہے اور گویا اس کے گم شدہ عضو کی اس طور پر تلافی کر دی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی تہام آبائی دولت دوسرے مہالک میں اپنے ملک کی وقعت برقرار رکھنے میں صرف کر دے تو بادشاہ اُسے دو گز فیتہ دے دیتے ہیں جو گویا اُس کے جائداد کے مساوی تصور کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جب تک بادشاہ کے پاس گز بھر فیلا یا سپز فیتہ موجود ہے تو اُسے مدبرین سپہ سالار اور سپاہیوں کی قلت کا اندیشہ نہیں رہتا ہے۔

میں ایسی سلطنتوں کی حسن و خوبی کے سمجھنے سے قاصر ہوں جہاں کے رہنے والے کثیر آبائی جائیداد کے باوجود معض خالی خولی الطاف و اکرام کے خاطر حقیقی صعوبتیں برداشت کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ کوئی شخص جس کے پاس معقول پرنسپل ہو جب وہ کسی ایسی خدمت کی انجام دہی میں مصروف ہوتا ہے جس سے اس کی عز و جاہ میں اضافہ ہو، تو اسے اپنے مرتبہ کے لحاظ سے بہت کچھ تکلیفیں برداشت کرنا پڑتی ہیں اور اس کے مقابلہ میں اسے کوئی ایسی حقیقی خوشی میسر نہیں آتی جس سے وہ پہلے محروم رہا ہو۔

درباریوں کے زمرہ میں داخل ہونے سے قبل وہ بفراغت کھاتا۔ سوتا جاگتا تھا خدمت سے مستفیض ہونے کی وجہ سے اس کی یہ حالت برقرار نہیں رہتی۔ خانگی حیثیت میں بھی خوشامدی اس سے اسی طرح لپٹے رہتے تھے جس طرح بر سر اقتدار ہونے پر اور اپنے گھر میں اپنی تہام رغبتوں اور خواہشوں کو وہ بلا پس و پیش لوگوں پر آشکارا ہوئے بغیر پورا کر سکتا تھا۔

جس شخص کے پاس خود دولت موجود ہو اس کی دولت میں کسی قدر اضافہ ہو جانے سے اسے کیا حقیقی مفاد ہوا۔ کچھ بھی نہیں کیا کسی امیر کی دولت بڑھنے سے اس کی بھوک بڑھ جاتی ہے؟ اگر یہ ہے تو اس قسم کی نظیریں بہت کچھ باعث دلچسپی ہو سکتی ہیں۔

کیا ایسا شخص جس کی ایک ہزار کی آمدنی ہو دو ہزار کی آمدنی ہونے پر دو بیویوں کی ہمراہی کا لطف اُٹھا سکتا

ہے یا بجائے ایک گونہ شکم پر ہونے کے دو گونہ شکم پر ہو سکتا ہے؟ اگر ایسا ہو سکتا ہو تو یقیناً ایسا شخص قابل معافی ہے، کیونکہ اس طور پر اس کا دائرہ مسرت وسیع ہو جاتا ہے۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ اس کا دائرہ مسرت وسیع ہو اس کی مسرت میں انعطاط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کی توسیع کے خیال سے تکالیف برداشت کرنے پر مجبور ہوتا ہے، اور جیون جیون دولت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، حصول مسرت کی صلاحیت اس میں سے مفقود ہوتی جاتی ہے۔

بجائے اس کے کہ بڑے آدمیوں پر رشک کیا جائے، مجھے تو ان پر ایک طور پر ترس آتا ہے۔ میں انہیں نیک نہاد گھراہ اشخاص متصور کرتا ہوں۔ اپنی تہام مسرتوں کے لئے جن سے وہ بہرہ اندوز ہوتے ہیں وہ خود اپنے نہیں بلکہ ہمارے مہنوں اور رہیں منت ہیں۔ وہ اپنے لئے نہیں بلکہ ہمارے لئے لباس فاخرہ کا بار اٹھاتے ہیں۔ ہماری خوشی کے لئے وہ لوازمہ سے آراستہ رہتے ہیں جو بڑے تزک و اختشام سے ان کے جلو میں رہتے ہیں۔ بڑے بڑے نازک دماغ شخص کے لئے اچکن اور ایک ملازم اس کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کافی ہے۔ جن لوگوں کے پاس سٹیکروں کی تعداد میں ملبوسات و ملازمین ہیں۔ وہ صرت ایک کو اپنے آرام کے لئے اور باقی ۹۹ کو ہماری مسرت افزائی کے لئے رکھتے ہیں۔ کنفیوشیس (Confucius) کا یہ مقولہ کس قدر صحیح ہے کہ ہم بجائے اس کے کہ خود اپنے آپ کو یہ اطمینان دلانے کی کوشش کریں کہ ہم مسرور

ہیں دوسروں کو اپنی مسرت کا یقین دلانے کے لئے تھام تکا لیف برداشت کرتے ہیں —

اسطرح کی نہائش کا لوگوں میں چرچہ ہونے اور اپنے رتبہ کی وقعت پر قرار رکھنے کی خواہش کو جاہ طلب اشخاص کے لئے باعث تکلیف ہو لیکن سوسائیتی کے لئے یہ امر مناسب ہے کہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو آرام و اطمینان کو خطرہ اور گزبھر فیتہ پر فٹار کرتے ہیں۔ ان کی خود نمائی سے ہمارا کچھ نہیں بگڑتا، کسی بچہ کو اس کے کھانے سے محروم رکھنا بہلا کب زیبا ہے؟ اگر کوئی تھوک یا تچڑ اپنے جاومیں آدمیوں کی قطاریں رکھنا پسند کرے، تو خود اس کے لئے یہ ایک بلا ہے۔ اگر وہ عام گذر گاہوں پر سنیکڑوں حاشیہ بردار ہماری مسرت افزائی کی غرض سے لئے پھریں تو یہ ان کے لئے کیا کم مصیبت ہے۔ صرف تھاشائی ہی مسرت افروز ہوتے اور مسرت پہنچاتے ہیں حاشیہ بردار اور جلوس کے شایق ان کے بار میں دبے رھتے ہیں —

ایک چینی عہدہ دار کی جس کو اس بات پر بڑا ناز تھا کہ اس کے تھام لباس میں جواہرات تکتے ہیں، راستہ میں ایک پجاری سے مدبھیڑ ہوئی۔ پجاری تھام گئی کوچوں میں اس کے ساتھ ساتھ پھرتا رہا، اور راستہ بھر اس کی تعظیم کرتا اور اس کے جواہرات کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ چینی نے اس سے مخاطب ہو کر کیا ”اے دوست میں نے تو کوئی جواہر تجھے نہیں دئے پھر اس حرکت سے کیا مطلب ہے“ پوجاری نے کہا تمہارے جواہر تو نہیں دئے لیکن مجھے ان کے دیکھنے

کا موقع دیا۔ ہم میں تم میں سوائے اس کے کوئی فرق
 نہیں کہ تمہیں ان کی حفاظت کی زحمت گوارا کرنا پڑتی ہے
 اور مجھے اس خدمت کے انجام دینے کی مطلقاً خواہش نہیں۔

(گولڈاسٹھہ)



من کی موج

(۲)

(ہم گزشتہ نمبر میں اپنے من-موجی دوست کا تعارف ناظرین نورس سے کرا چکے ہیں، پہلی موج میں انہوں نے اسمائے صفات کے متعلق اظہار خیال فرمایا تھا، اس دوسری موج میں دنیا کے نئے پرانے معیاروں کا ذکر ہے، وہ شکایت کرتے ہیں کہ ایک طرف تو لوگ ”دور نو“ اور ”عصر جدید“ کا شور مچاتے ہیں، اور دوسری طرف اپنے پرانے معیاروں کو نہیں بدلتے، ہم اس کے متعلق اپنی ذاتی رائے محفوظ رکھتے ہیں، اعتراض و تنقید کا موقع تو وہاں ہے جہاں فکر رہلما ہو، لیکن من کی موج ارسطو اور مل کے منطقی قوانین کی پابند نہیں ہو سکتی، اگر ہمارے من-موجی دوست اجازت دیں تو ہم ان کو ایک گُر کی بات بتائیں اور وہ یہ ہے کہ حق بات کڑوی ضرور ہوتی ہے، لیکن ہر کڑوی بات حق نہیں ہوا کرتی۔ اڈیٹر :

”دنیا بدل رہی ہے“!

کل اتفاقاً یہ الفاظ مجھے سنائی دئے، میں حسب دستور

اپنے مکان کے دروازے پر بیٹھا ہوا تھا، سامنے ایک نئی صہارت بن رہی ہے، مزدوروں نے لکڑی اور بانس کا ایک بڑا ارنچا مچان بنایا ہے، دو دو تین تین بھاری پتھر سر پر رکھے ہوئے اس مچان پر چڑھ رہے تھے۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا میں سوچ رہا تھا کہ کیا اس مکان، اس مچان اور ان مزدوروں کی طرح ہم سب اس سنسار میں اپنی بلندی دوسروں کی بلندی کے لئے بناتے ہیں..... کیا آتش بازی کی ہوائی کی طرح ہم سب محض اس لئے اوپر اُرتے ہیں کہ دوسرے خوش ہوں اتنے میں یہ الفاظ میرے کان میں پڑے:—

”دنیا بدل رہی ہے“

میں نے مڑ کر دیکھا، میرا دوست ہاتھ میں ایک اخبار لئے ہوئے کھڑا تھا، آنکھوں میں چمک، ہرنتوں پر ویسی ہی ہنسی جیسی بالک سپنے میں ہنستے ہیں— کہنے لگا:—

”جانتے ہو یہ کیا بن رہا ہے؟ یہاں بے تار کی خبر رسانی کا اسٹیشن ہو گا، ولایت کے گانے امریکہ کی تقریریں یہاں سنائی دیں گی۔ دنیا بدل رہی ہے“—

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ میں جب کبھی ”بیسویں صدی“ ”نیا زمانہ“ ”نئی دنیا“ ”نئے خیالات“ اور اسی سانچے کے تھالے ہوئے دوسرے الفاظ سنتا ہوں تو بے اختیار ہنس دیتا ہوں، میں نے جواب دیا— ”ہاں! پرانی آتھ نیا روپ لے رہی ہے، پرانے چھلکے پر نیا چھلکا

فکل رہا ہے، لیکن گودا دھڑی ہے جو دیدوں کے زمانے سے پہلے تھا۔“ میرے درست نے اپنی عادت کے موافق بڑے زور سے قہقہہ لگایا، کہنے لگا۔ ”تم نے تو دنیا کو تہج دیا ہے، جگ کے الت پھیر تم کیا جانو! کل صبح زبردستی تم کو اپنے ساتھ لے چلے گا۔ تب تم کو معلوم ہو گا کہ ہماری دھرتی کدوت لے رہی ہے یا نہیں۔“ یہ کہا اور ہنستا ہوا چلا گیا۔

میں ددز تک اسے دیکھتا رہا۔ کیسے بے فکر اور بھولے لوگ ہیں، ایک جیب میں رلایتی سرفا ہے، دوسری میں دیسی کسوتی، اُسے اس پر کستے ہیں، زرد لکیر دیکھ کر اُسے گندن سمجھتے ہیں..... اصلی بدلنا تو کسوتی کا ہے!

میں پھر مکان، مچان اور مزدور کی دھن میں لگ گیا، یہ دو ہاتھ دو پانوں کے پتالے اسی طرح اپنی ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ نیچے سے ادر لے جا رہے تھے.....

آج میرا درست مجھے شہر میں ادھر ادھر پھراتا رہا۔ اس نے مجھے نئی نئی عمارتیں دکھا ئیں، پرانے ایلٹ پتھر کے نئے استہان! پرانی آتھا کے نئے روپ!! ”یہ نئی سڑک ہے، اس پر تریم چلے گی“..... ”یہ نیا بلک ٹھر ہے“..... ”یہ نئی دکان ہے“..... ”یہ نئے قسم کا مدرسہ ہے“۔ خدا معلوم کیا کیا بتاتا رہا اور باتیں کرتا رہا، وہ بہت خدش تھا، جیسے ترکیا ہنس ہنس کر اپنی سہلیوں سکویوں کو روانی دے گیوں کے نئے زیور دکھاتی ہیں۔! میں نے کوئی جواب نہیں دیا، کانوں میں اس کی آواز آرہی تھی، لیکن اندر والا کھڑی

کی ”تک تک“ کی طرح برابر یہی کہہ رہا تھا.... اصلی بدلنا تو کسوتی کا ہے! جب تک دُیا تو کہنے لگا۔ ”اب قائل ہوئے کہ نہیں! شانتی پور بدل رہا ہے۔ دنیا بدل رہی ہے“ میں گھلندی سانس بھر کے چپ ہو گیا۔

سامنے ایک حلوائی کی دوکان تھی۔ توازن ہاتھ میں لئے ہوئے کچھہ تول رہا تھا۔ میں اپنے دوست کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں لے دیا، حلوائی سے کہا:

”لاہ! دنیا بدل رہی ہے، تم اپنے بانٹ بدل دو“ ہنسنے لگا۔ کہا ”ہمارے یہاں اسی کا چلن ہے، گاہک نہیں مافتے“.... پھر ایک بزاز کے یہاں گئے۔ پکڑا فاپ رہا تھا، میں نے کہا ”اپنا گز نہیں بدلتے“ اس نے منہ پھیر لیا...۔

راستہ میں ایک سپاہی ملا، اس کے ساتھ ایک بھلا سانس تھا، ہاتھ میں ہتکڑی، آنکھوں میں شرافت! میں نے کہا ”جمعہ دار صاحب! اسے کیوں پکڑا ہے“ کہنے لگا:

”اس نے ایک دوکان سے اپنے بچوں کے لئے آقا چرایا ہے“ میں نے: ”کیا دنیا نے چوری کا معیار ابھی نہیں بدلا....۔ وہ مجھے گھبراتا ہوا چلا دیا۔“

سچا بول افدرا بن کا پوئل ہوتا ہے

تھوڑی دیر چل کر ایک مکان میں پہنچے، ایک لکڑی کے تختے پر بڑے مزٹے حرفوں میں لکھا ہوا تھا ”سیتھہ اشرفی مل کا پن خانہ“ ہزاروں اپاہج اور نکمے جمع تھے،

زبردستی کے ابا بچ! کام کے نکمے !! میں نے داروغہ سے پوچھا۔ ”بھائی انہیں خیرات کیوں دیتے ہیں؟“ کہنے لگا۔ ”نیک کام ہے، سیٹھ کی دینا معلوم ہوتی ہے، فیاضی ہے“ نیک کام! دینا! فیاضی! سب وہی پرانے سافچے! کیا واقعی دنیا بدل رہی ہے.....

پرانے بانٹ، پرانا کُز! پرانا قاذرنی معیار! پرانا اخلاقی معیار! دنیا میں ہر طرف وہی پرانی کسوٹی! اور اندر سے آتھا کی وہی پرانی تک تک..... ”اصلی بدلنا کسوٹی کا ہے!“ میں نے اپنے دوست کی طرف غور سے دیکھا۔ دینا دنیا بدل رہی ہے! اس نے آہستہ سے کہا ”معلوم ہو گیا، اب لوٹ چلو“

دھرتی آے دن نیا سونا اُگلتی ہے۔ سنساز اپنا روپ نت نیا بدلتا ہے، پرانے بانٹ گھس گئے۔ پرانے کُز چھوٹے ہو گئے۔ بہت سے پرانے جرم ہلکے ہو گئے، پرانی نیکیاں بدیاں، اور پرانی بدیاں نیکیاں ہو گئیں، پرانے معیار، پرانی کسوٹیاں آج کام کی نہیں، رہیں، پھر دنیا، انہیں کیوں نہیں بدلتی! ست جگ کے ست کرکاجگ میں بھی ست کیوں جانتی ہے! ایک پن خانہ قائم کر کے دس کی بنیاد کیوں رکھتی ہے۔ آج سانپ کی رکھشا کرنے کی نیر لا کیوں پالتی ہے۔..... نئے کندن کے لئے نئی کسوٹی کیوں نہیں تھوند ہتی۔ وہی حلوائی کی بات:—

گاھک نہیں مانتے.....

اب میرا درست ”دھرتی کی کورت“ کا قایل نہیں رہا،
 میں اس سے کبھی کبھی مذاق میں پوچھتا ہوں ۔۔۔۔ ”دنیا
 کب بدلیگی؟“ اس سوال کو سنکر اس کی حالت بدل جاتی ہے،
 آنکھیں پھیل کر ایسی ہو جاتی ہیں جیسے کوئی شام کے دھند لکے
 میں دور کی چیز دیکھ رہا ہو، وہ بہت دھیمی آواز سے
 جواب دیتا ہے —

”جب گاہک مانیں گے!“

من - موجی

ہاقی آئندہ



ہندوستان کی سب سے پہلی کرنسی کمیٹی

سنہ ۱۷۸۷ عیسوی

(ایس۔ ایم۔ جکتاب و مرثقی خاں متعلمین سال دوم عثمانیہ کالج
اورنگ آباد دکن)

چند ماہ قبل ایک رائل کرنسی کمیشن حکومت ہند کی
طرف سے ہندوستانی زر کے متعلق مقرر کیا گیا ہے اس سلسلہ
میں اگر سب سے پہلے ہندوستانی کرنسی کمیشن کے متعلق کچھ
لکھا جائے تو وہ صرف تاریخی نقطہ نگاہ سے اہم ہی نہیں
بلکہ دلچسپ بھی ہوگا۔

مہروں پر بتہ | سنہ ۱۷۶۶ء سے جو دو فلزی طریقہ اختیار
کیا گیا تھا وہ صرف کلکتہ کی حد تک محدود تھا۔ مہریں
ایک غیر متعین شرح پر گردش کرتی تھیں۔ اس شرح کا
انعصار بازار کے سونے اور چاندی کے نرخ پر تھا۔ اور تقریباً
(۱۶) سال تک یعنی سنہ ۱۷۶۹ء سے سنہ ۱۷۸۵ء تک اس نرخ
میں کوئی زیادہ اضافہ واقع نہیں ہوا۔ لیکن سر جان شور
صاحب کی سنہ ۱۷۹۶ء کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۷۸۶
کے آغاز میں مہروں پر بتہ کے اضافے کی شکایتیں شروع ہوئیں
اور کلکتہ میں مہروں کا اضافہ ہونے لگا۔ چنانچہ لوگوں

نے ان کو ضرورت سے زیادہ متدار میں اپنے خانگی اغراض کے لئے جمع کرنا شروع کیا حتیٰ کہ ماہ اگست سنہ ۱۷۸۸ء میں ایک ماہ کی تر وای (۳) روپیہ تک پہنچ گئی۔ جو اسی سال ماہ مارچ میں صرف - آنے تھی۔

انفکاد کمیٹی - ستمبر سنہ ۱۷۸۷ء میں لاوڈ رفرالس نے ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی کہ وہ چاندنی کے سکن کی کمی اور بٹہ کے اضافے کے اسباب دریافت کرے اور اصلاحی تجاویز پیش کرے۔

مہمان کمیٹی | اس کمیٹی کے کل ۶ ممبر تھے۔
 ہربرٹ ہیرس، رچرڈ جانسن، سی، کک ریل، جان برگ، ولیم ہارٹنگ، اور لمبرٹ جو غالباً سکریٹری تھا۔ زیادہ تر اس کمیٹی میں سرکاری افسروں کی تعداد تھی لیکن پھر بھی یورپی سوداگروں کی کافی نمائندگی تھی، کیوں کہ اس زمانہ میں کمپنی کے ملازم تاجر بھی ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ ہیرس وغیرہ جیسے اشخاص تجارت میں مشغول تھے۔ اس کمیٹی نے تاجروں کی نمائندگی بالکل اسی طرح کی جیسے کہ زمانہ حال کا رائل کرنسی کمیشن ہے؛ آج اتنا اضافہ اور ہے کہ ایک معاشیات دان، چند ہندوستانی تاجر اور چند غیر ملکی ماہرین بھی کمیشن میں شریک ہیں۔

اُس زمانے میں مسئلہ زر Currency اس قدر اہمیت نہ رکھتا تھا جیسے آج کل۔ چنانچہ کمیٹی نے اپنا کام صرف (۶) ماہ کے اندر ہی ختم کر لیا اور ایک جلسہ اس کے قیام کے دو روز بعد ہی منعقد ہوا۔ اور بعد ازاں ہفتہ واری جلسے ہونے لگے

اس کمیٹی کے کل آٹھ جاسے ہوئے۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ کے ساتھ ایک معذرت نامہ بھی داخل کیا کہ وہ اپنے مفروضہ فراڈس کو پوری طور سے انجام نہ دے سکی لیکن اس پر بھی اس کی رپورٹ ۳۰ صفحات سے کم نہ تھی۔

کمیٹی نے ۵) پانچ گھنٹوں کی شہادتیں لیں جن میں تین مارواڑی ساہوکار اور دو بنگالی صراف تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بنگالیوں میں اس زمانہ میں زیادہ ساہوکار نہ تھے۔ شہادتوں کے سننے کا طریقہ بالکل سادہ تھا، آج کل کی طرح کوئی طویل تحریری شہادت پیش نہ کی گئی۔ مرقعہ اندی جو گویال داس کا گھاشٹہ تھا (شہادت سب سے پہلے لی گئی اس نے حسب ذیل شہادت دی :-

۱- سوال مہروں پر پتہ لگانے کا کیا سبب ہے؟

۱- جواب چاندی کے سکوں کی طلب میں اضافہ۔

۲- س کن کن مقامات میں ”سکہ روپیہ“ روانہ کیا جاتا ہے؟

۲- ج ہر جگہ جہاں خرید ہوتی ہے۔

۳- س کیا تھاکہ میں صرف ارکاٹی روپیہ نہیں چلتا ہے؟

۳- ج کاکتہ سے (۱۹) لاکھ ”سورتنی سکھ کا روپیہ“ تھاکہ کو روانہ کیا گیا ہے۔

۴- س گذشتہ سال چاندی کے سکوں پر پتہ کیوں نہیں لگایا گیا؟

۴- ج اس وجہ سے کہ ان کی تعداد کافی تھی۔

۵- س اس کی کیا وجہ؟

- ۵-ج یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں:—
- ۶-س کیا تم نے کسی وقت اس کہی کے اسباب پر غور کیا؟
- ۶-ج میں نے اس مسئلہ پر کبھی غور نہیں کیا!
- ۷-س یہ کہی اس وجہ سے تو واقع نہیں ہوتی ہے کہ لوگوں نے اپنی خانگی اغراض کے خاطر روپیہ جمع کر رکھا ہے؟—
- ۷-ج صرات تو ایسا نہیں کرتے۔ اور میں دوسروں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا—
- ۸-س کیا تم نے کبھی چاندی کے سکوں کی خرید اور فروخت کی ہے؟
- ۸-ج میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ میں صرف ہندی کا بیوپار کرتا ہوں!—
- ۹-س وہ کون لوگ ہیں جو چاندی کے سکوں کا بیوپار کرتے ہیں؟—
- ۹-ج وہ بنگالی بازاری صرات ہیں—
دوسرے گواہ کا بیان
- اس کے بعد دوسرا گواہ فیملی چرن، جو سیو رام پال کا گھاشٹہ اور بنگالی بازاری صرافوں کا نہایت تھا، پیش کیا گیا۔ اور اس نے فطرتاً یہ الزام برے برے مارواڑی صرافوں کے سر لگایا۔ اس گواہ نے اپنی شہادت میں متضاد بیانات دیئے، مثلاً اس نے بتہ کی وجہ یہ بتلائی کہ نیا سک نہیں بنا لیکن جب پوچھا گیا کہ کیا سک سازی کی غرض سے چاندی داخل کی گئی تو کوئی جواب نہ دے سکا۔ پھر اس پر حسب ذیل

جرح ہوئی —

۱- س اس سال چاندی کی مقدار میں کمی کیوں واقع ہوئی؟ —

۱- ج کیوں کہ گذشتہ سال وہ زیادہ مقدار میں تھی۔
میں صرف ایک معمولی بیوپاری ہوں اور بڑے بڑے
بیوپاریوں سے خرید کیا کرتا ہوں —

۲- س وہ بڑے بڑے بیوپاری کون ہیں؟ —
۲- ج گوپال داس، نند رام بیدی ناتھ، سامبرو ناتھ،
ارجن جی فالگی —

۳- س وہ چاندی کے روپے کس طرح حاصل کرتے ہیں؟ —
۳- ج یہ مجھکو معلوم نہیں۔ اس شاہد نے روپیوں کی
کمی کا باعث رسد کی کمی کو قرار دیا اور روپیہ
کے جمع کئے جانے کے متعلق تجاہل سے کام لیا۔ لیکن
دبی زبان سے یہ کہا کہ ”میں اتنا ضرور کہوں گا
کہ چاندی کی رسد کے مقابلہ میں طلب بہت
زیادہ ہے“ —

باقی ماندہ دو گواہوں ہری پرشاد اور کونائے سیل
(گھاشتگان بلول داس اور نلہر سیل) کے بیانات بھی اسی قسم
کے تھے۔ یہ شہادتیں بالکل غیر تشفی بخش تھیں۔ کمیٹی مذکورہ
بالا اشخاص سے یہ اقرار کروانا چاہتی تھی کہ چاندی کی کمی کا
باعث اس کا جمع کیا جانا ہے اور اس غرض سے کمیٹی نے
گھاشتوں سے آسان سوالات کئے۔ لیکن گھاشتوں نے نہک حلالی
سے کام لیکر چاندی کی کمی کو اس سبب کی طرف منسوب

ہی نہ کیا۔ ان کے بیانات سے اصلی مسئلہ کی کچھ بھی وضاحت نہ ہو سکی۔ —

سونے کی غیر ہر دلعزیزی۔ کمیتی نے زیر بحث مسئلہ پر دو مختلف پہلوؤں سے بحث کی۔ اس نے پہلے مہروں کے ہر دلعزیز نہونے کے وجوہات تشریح سے بیان کیں۔ انہوں نے بتلایا کہ طلائی مہروں کی قیمت کی زیادتی (تقریباً ۳۶ شلنگ) انہیں کلکتہ کے باہر وسیع حصہ ملک میں مروج نہیں ہونے دیتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مہریں دھاکہ، مرشدآباد، پٹنہ، اور بنارس میں چلتی ہیں لیکن یہ سب ملا کر بھی شہر کلکتہ کی کل مہروں کے مقابلہ میں ایک چوتھائی سے بھی زیادہ نہیں۔ اس طرح کسی سکے کا کسی خاص مقام میں جمع ہو جانا اس سکہ کی کثرت کا باعث ہوگا اور زر کاغذی کی گردش سے اس پریسیدنسی کی زر کی مجموعی مقدار میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دیوہ کروڑ سرٹیفکٹ اور اسی قدر تھسکات بینک نوٹ وغیرہ کے علاوہ شہر میں رائج ہیں۔ اور زر کی اس کثرت کا وہی نتیجہ ہوگا جو خود سونے کی مقدار کی زیادتی کا ہوتا۔ —

ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں پر مسئلہ مقدار زر سے بحث کی گئی ہے لیکن مبہم ہے —

چاندی کی ہر دلعزیزی۔ بعد ازاں کمیتی اس مسئلہ پر بحث کرنے لگی ”چاندی کی زیادتی کی کیا وجہ ہے“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مہروں پر ہتھ کے کتنے اور چاندی پر اس کے ملنے کو علیحدہ علیحدہ چیزیں سمجھتی تھی اس کی

رائے میں کمی کی وجہ، سنہ ۱۷۵۷ ع سے اس کی درآمد کا کم اور درآمد کا زیادہ ہونا ہے کیونکہ چاندی دوسری پریسیڈنسیوں اور چین کو روانہ کیجاتی ہے۔ اور ضرور ہے کہ اس کی وجہ سے خود بنگال میں سونے اور چاندی کی نسبت ہمیں مستقلاً تبدیلی پیدا ہو۔ لیکن کمیٹی سنہ ۱۷۸۷ ع میں مہروں پر بقیہ میں یکایک زیادتی ہونے کی وجہ بتلا نہ سکی۔ کمیٹی نے اس زیادتی کو ان ہندیوں کے کثیر استعمال سے منسوب کیا جو کلکتہ میں مالگزاری کی ادائی کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ لیکن ”کلکتہ میں فقرئی سکھ کی کمی کا باعث (جو غالباً اپنی اہمیت کے اعتبار سے مذکورہ صدر وجوہ سے کم نہیں ہے) شاید یہ ہو کہ سونے کے سکھ کی قیمت چاندی کے سکھ کی قیمت کے مقابلہ میں بہت ہی زیادہ ہے۔“

سفارشات - کمیٹی نے مذکورہ بالا معلومات کی بناء پر حسب ذیل اہم سفارشیوں کی ہیں:-

۱- ”جس قدر روپیہ گورنمنٹ کے ہاتھ آئے، اتھنی اور چونی جاری ہو۔ اور انگریزی معیار کی طرح اس میں بھی بھرت ملائی جائے۔“

۲- انفرادی طور پر سکھ سازی کی فیس نہ لی جائے۔

۳- اسی طرح سونے کی مہروں کو آدھے، پاؤ، آتھویں حصوں میں تقسیم در تقسیم کیا جائے۔ لیکن موجودہ معیار میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

۴- ان صرافوں کو سخت سزا دی جائے جو جدید مضروب

طلائی مہر کے معاوضہ میں جدید (۱۶) روپیہ سے کم دیں۔

۵- سونے اور چاندی کے سکوں کی قیمت میں وہی تناسب رکھا جاوے جو ہندوستان میں سونے اور چاندی کی قیمت میں پایا جائے۔

کاکرل کی مخالفانہ رائے کا خلاصہ - کاکرل نے کمیٹی کی رپورٹ پر اپنا ایک حاشیہ لگایا جس میں اس نے کمیٹی کی رائے سے حسب ذیل وجوہ پر اختلاف کیا:-

(۱) کہ چاندی پر بقمہ کا باعث مالگزار کی ادائیگی کی ہندیوں کا کثیر تعداد میں ہونا ہے۔

(۲) دفعۃً بڑی مقدار میں یکایک نوٹس کا رائج ہونا بھی اس کا سبب ہے۔ جنرل بینک قرض دینے کے لئے ضمانتیں طلب کرتے ہیں اور اس طرح ہندوستانیوں کے سامنے ایک بری مثال پیش کی جاتی ہے جس کی وجہ سے عام ساکھ کو بہت صدمہ پہونچتا ہے۔

(۳) دستاویزات وغیرہ کا اجرا سنہ ۱۷۸۷ ع میں ہوا نہ کہ سنہ ۱۷۸۶ ع میں اور سرٹیفکٹ کا اجرا بقمہ کا باعث نہ تھا۔

اس کا کمیٹی کے بہت سے ممبروں نے اس طرح جواب دیا کہ جہاں تک کاکرل کے پہلے اعتراض کا تعلق ہے تو وہ	کمیٹی کی طرف سے اس کی تردید
--	-----------------------------

فی الحقیقت چاندی کی گرانی کی ایک بڑی وجہ تھی اور تیسری وجہ کو تو خود کمیٹی تسلیم کرچکی ہے دوسرے اعتراض کے متعلق انہوں نے یہ حجت پیش کی کہ بیانک نوٹس تقریباً (۱۲) لاکھ کی مالیت کے رائج ہیں اور یہ مقدار ایک خاص

قسم کے زر نقد میں پوری طور سے کمی پیدا نہیں کر سکتی۔ انگلستان میں، جہاں بینک نوٹس کثیر تعداد میں رائج ہیں، کسی شخص نے چاندی کی عارضی کمی کو اس واقعہ سے منسوب کرنیکا خیال نہ کیا، کمپنی کے بہت سے ممبروں نے یہ بھی حجت پیش کی کہ بینک کا ضمانتی قرضہ دینے کا طریقہ بھی کوئی عجیب طریقہ نہ تھا اور نہ ہی اس سے ”کوئی ایسی نظیر قائم ہوئی جو عام ساکھ کے لئے مضر ہوتی اور نہ قرض کا یہ طریقہ کسی دوسرے بینک میں عام اعتبار کی کمی کا باعث ہوا۔“

یہ ممکن نہیں کہ اس مختصر مضمون میں رپورٹ کے بہت سے دلچسپ حصوں کو زیادہ تفصیل	معاشین کے لئے رپورٹ دلچسپ ہے
--	---------------------------------

کے ساتھ بیان کیا جائے۔ البتہ یہاں ایک اہم واقعہ کی طرف مکرر اشارہ کیا جاتا ہے۔ اس رپورٹ میں Adam Smith صاحب کی Wealth of Nations کا حوالہ دیا گیا ہے اور مذکورہ بالا بحثوں کے پڑھنے سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کے ممبر معاشیات کے ان اصولوں سے واقف تھے جو اس وقت انگلستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے پہلے قدر زر کے اس نظریہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو رپورٹ میں پیش کیا گیا ہے اسی طرح سے بنگال میں محصول نمک کے بار کے متعلق بھی ایک نہایت دلچسپ بحث اُٹھائی گئی ہے اس طرح یہ رپورٹ معاشیات کے طالب علموں کے لئے خاصی دلچسپ ہے۔ اگرچہ اس کی قدر و منزلت

(۱۳۸) برس گزر جانے کی وجہ سے کم ہو گئی ہے، بایں ہمہ یہ ظاہر ہے کہ سنہ ۱۷۸۷ء کی کرنسی کمیٹی نے اسی قسم کے مسئلہ پر جو موجودہ رائل کمیشن کے زیر غور ہے، بحث کی تھی۔ کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ طلائی سکے اور چاندی کے روپیہ کا قدیم تناسب روپیہ میں بھرت کا اضافہ کر کے قائم رکھا جاوے۔ اسی طریقہ کو سر داتی بال لال نے اپنی minority رپورٹ میں Bapington Smith Committee کے سامنے پیش کیا تھا۔ سنہ ۱۷۸۷ء کی کرنسی کمیٹی کی طرح موجودہ رائل کمیشن کو یہ تصفیہ کرنا ہوگا کہ سونے کے ساورن اور چاندی کے روپیہ کی شرح مبادلہ کیا رہے اور ان کی سرکاری اور بازاری قیمت کا تفاوت دور کرنا پڑیگا۔ کمیٹی کے ملازمین محض تاجر نہ تھے برطانوی نظم حکومت کے طالب علم کو ۱۷۸۷ء کی کمیٹی کی رپورٹ کے مطالعہ سے ایک فائدہ اور ہوگا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ کمیٹیوں کے ذریعہ تحقیقات کا طریقہ ابتدائی حکومت میں بھی، بالکل وہی تھا۔ جو آج کل ہے۔ سنہ ۱۷۸۸ء میں کرنسی کمیٹی کے بھی صدر اور سکریٹری تھے کمیٹی نے سوال بند بھی مرتب کیا تھا گواہوں پر جرح بھی ہوتی تھی یادداشتیں بھی طلب کی گئی تھیں اور اعتراضی نوٹ بھی شریک کیا جا چکا ہے۔ اس ماک کے ابتدائی برطانوی عہدہ داروں کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ وہ محض ناخواندہ قسمت آزما لوگ تھے جو اس ملک میں صرف ”سونے کا درخت“

ہلانے کے لئے آئے تھے - سنہ ۱۷۸۷ ع کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر ایسی رائے کا قائم کرنا قرین انصاف نہیں ہے۔ کہ جان کمپنی کے بعض ملازمین اس قدیم زمانے میں بھی مشہور انگریزی معاشیات دانوں کی تصنیفات پڑھتے تھے اور ان کے نظریوں کا استعمال اس ملک کے معاشی مسائل کے حل میں کیا کرتے تھے -



اخبار علمیہ

اس بات سے بہت کم لوگ رائف ہیں کہ برطانیہ کی طرح چین کو بھی ایک ”ان سائیکلر پیڈیا“ کی ترتیب کا شرف حاصل ہے، یہہ زبردست تالیف سنہ ۱۷۷۲ میں مکمل ہو چکی تھی، لیکن اب تک اس کی طباعت کا تصفیہ نہوا تھا یہ ۳۶۰۰۰ مجلدات پر مشتمل ہے، یہ جلدیں اب تک ایک شاندار دو منزلہ عمارت میں بحفاظت تھام رکھی رہیں اور اب شنگھائی کا کمرشیل پریس انہیں چھاپے گا ناظرین کو اس تالیف کی ضخامت کا اندزہ اس سے ہوگا کہ ہر مجلد ۱۸ × ۱۲ سائز کا ہے، اور یہ ایک اسپیشل ترین کے ذریعہ پیکنگ سے شنگھائی پہنچائی جائیں گی، اس کی طباعت کے لئے ۱۰ سال کی ضرورت ہوگی، اس کے تیس ہزار سے بے حساب ست ہزار روپیہ فی ست اور چھوٹے بحساب نو ہزار روپیہ فی ست تیار ہونگے۔

کیا ہماری زبان اس قسم کی تالیف کا کوئی خواب دیکھ سکتی ہے ؟ -



کان کنی اب تک قسمت کا کھیل سمجھا جاتا تھا۔

اور بہت کچھ صرفے اور محنت کے بعد بھی دھاتوں کا دستیاب ہونا مقدر یا اتفاق پر منحصر تھا، لیکن اب ایسے آلے بنائے گئے ہیں جن کی مدد سے افسانہ بغیر زمین کھودے ہوئے معدنیات کی موجودگی یا عدم موجودگی کا پتہ لگا سکتا ہے چنانچہ امریکہ کی تیل اور کان کنی کی اکثر کمپنیاں ان آلوں کو کامیابی کے ساتھ استعمال کر چکی ہیں۔



تعلیم نسوان کے سلسلہ میں اب تک دست کاری کشیدہ کاری، خانہ داری وغیرہ کے مدرسوں کا حال سننے میں آتا تھا، لیکن حال میں بوسٹن (امریکہ) کے نسوانی کالج میں ایک نیا شعبہ بیویوں کی تعلیم کے لئے کھولا گیا ہے۔ اس میں لڑکیوں کو آئندہ ازدواجی زندگی کے متعلق تعلیم دی جائیگی اس کا نام شعبہ محبت و نکاح ہے مدرسے کی طرح، نصاب تعلیم بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہے، بوسٹن یونیورسٹی کے اساتذہ اپنا کچھ وقت اس شعبہ کو بھی دیتے ہیں مثلاً نفسیات کا پروفیسر، نو جوان خواتین کو مردوں کی نفسیات خصوصیات سے آگاہ کرتا ہے، اور عورتوں اور مردوں میں جو ذہنی اور نفسی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی طرح سے حساب کا پروفیسر خانہ داری پڑھاتا ہے اس سے آگاہ کرتا ہے۔ معاشیات کا پروفیسر طالبات کو امریکی خاندانوں کی معاشی زندگی کے مختلف پہلو بتاتا ہے اور عمرانیات (Sociology) کا پروفیسر صنف قوی و نازک کا باہمی تعلق، عورتوں کے حقوق ان کی ملازمت وغیرہ کے متعلق

درس دیتا ہے۔ شادی کے مسئلہ کی تحقیق خاص طور پر کی جاتی ہے، اور لڑکیوں کو خاص طور پر یہ سکھایا جاتا ہے کہ وہ جذبات سے الگ ہٹ کر شادی کے مسئلہ کو صرف کاروباری اور تجارتی حیثیت سے دیکھیں، جب نصاب کی تکمیل ہو چکتی ہے تو کامیاب لڑکیوں کو (C.B. Certified Bride) سند یافتہ زوجہ کی تگڑی دی جاتی ہے۔ اس ”شعبہ محبت و نکاح“ کی صدر مسز میکہ و نیات نام کی ایک خاتون ہیں، ہم ناظرین کی دلچسپی کے لئے اس عجیب و غریب امتحان کا ایک سوال درج ذیل کرتے ہیں—

”میری براؤن ایک عورت ہے، وہ گلف (Golf) کی شوقین ہے۔ اسے کلب کی زندگی اور مجمع سے نفرت ہے، سگریٹ پینا بھی اسے ناپسند ہے، اس کے شوہر کا وقت زیادہ تر کلب کی دلچسپیوں میں صرف ہوتا ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے محبت ضرور ہے، لیکن مذاق میں فرق ہے۔ میری چونکہ ایک سنجیدہ خاتون ہے اس لئے وہ یہ تصفیہ کرتی ہے کہ.....“

اس جملہ کو ۲۰۰ الفاظ میں مکمل کرو۔

بات یہ ہے کہ جو مالک جیسا ہوتا ہے اس کی ہر بات اُسی رنگ میں تھل جاتی ہے۔ تجارتی ملکوں میں شادی بیاہ بھی تجارت کی ایک شاخ ہو گئی ہے۔ شادی کو اگر جذبات سے اور خاص کر جذبہ محبت سے الگ کر کے دیکھا جائے تو ایک معمولی ”سودا“ ہو جائیگا۔ آج کل اکثر ہمارے فوجوان بھی اور خاص کر یورپ کے تعلیم یافتہ شادی کو اسی نظر سے

دیکھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ لڑکی کیسی ہے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس سے شادی کرنے سے روپیہ کس قدر ملے گا۔

جزیرہ سہاترا میں حال ہی میں دنیا کا عجیب ترین پھول دیکھا گیا، کھلنے کے ۲۲ دن کے بعد تک اس کا طول صرف ۱۹- انچ تھا لیکن دو ہفتے کے بعد ہی یکایک ۴ فٹ ۴- انچ ہو گیا۔ چالیسویں دن اس کا طول ۸ فٹ ہو گیا۔ اس کے تین دن بعد ہی یہ پھل مرجھا گیا‘

اب تک فصلیں کاٹنے کے بعد میدانوں میں سکھائی جاتی تھیں، لیکن اب ایک ایسی مشین بنائی گئی ہے جس کے ذریعہ سے غاہ اور گھاس کے انبار ذرا سی دیر میں خشک کر لئے جائیں گے، یہ مشین گرمی، جازے، برسات ہر موسم میں کام لے سکتی ہے اور اس طرح سکھانے میں جو اخراجات ہوں گے وہ دستی محنت کے مقابلہ میں بہت کم ہوں گے۔ دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ دھوپ میں سکھانے سے گھاس کے جو ضروری اجزا جاتے رہتے ہیں وہ بھی اب محفوظ رہیں گے اور مصنوعی طریقوں سے سکھائی ہوئی گھاس میں دھوپ میں خشک کی ہوئی گھاس کے مقابلہ میں زیادہ غذائیت ہوگی خیال کیا جاتا ہے کہ اگر اس مشین کا استعمال عام طور پر ہونے لگے تو خراب فصلوں کا کوئی اندیشہ نہ رہے گا اور زراعت میں ایک نیا انقلاب ہو جائے گا‘

اب تک مدافعت کے لئے تپنچے اور دوسرے اسلحہ استعمال کئے جاتے تھے، جس سے اتلاف جان کی نوبت آتی تھی، لیکن اب امریکہ میں ایک نئے قسم کا آلہ بنایا گیا ہے، جس سے مدافعت بھی ہو جاتی ہے، اور کسی کی جان بھی نہیں جاتی، یہ ایک چھوٹا ننڈا ہوتا ہے، جو اندر سے خالی ہوتا ہے اور اس کے اندر ایک قسم کا گیس بھرا رہتا ہے، جو بتن دباتے ہی تیزی کے ساتھ باہر نکلتا ہے، اس گیس کی خاصیت یہ ہے کہ ۵۰ فٹ کے فاصلہ تک اس سے افسانہ عارسی طور پر بھارت سے معزوم ہو جاتا ہے۔ آج کل امریکہ میں بینک کے چپراسی اور دوسرے راہگیر رات کے وقت چوروں سے بچنے کے لئے اس آلہ کو اپنے پاس رکھتے ہیں یہ بھی پستول کی طرح آسانی سے جیبوں میں رکھا جاسکتا ہے۔

جرمنی اگرچہ میدان جنگ میں شکست کھا چکا ہے لیکن صنعت و حرفت کے میدان میں وہ اب بھی پیش پیش ہے، وہاں آج کل دنیا کا سب سے بڑا برقی انجن (Dynamo) تیار کیا جا رہا ہے، اس کے ذریعہ سے ۱۵۰۰۰ کھربوں کی طاقت پیدا کی جاسکے گی، یہ قوت افغانستان کے سب سے بڑے برقی انجن کی قوت سے دوگنی ہے۔

گزشتہ ۵ سالوں میں ہندوستان میں یونیورسٹیوں کی تعداد دگنی ہو گئی ہے، ملک کے بعض ماہرین تعلیم اس اضافہ کو شبہ کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ہم ان کی توجہ

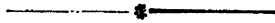
کے لئے ذیل میں جاپان کی یونیورسٹیوں کی تعداد درج کرتے ہیں، اگر ان پر نظر ڈالتے وقت جاپان اور ہندوستان کے رقبہ اور آبادی کے تناسب کو مد نظر رکھا جائے، تو نتیجہ زیادہ سبق آموز ہوگا۔

یونیورسٹیوں کی تعداد	سال
۶	۱۹۲۰
۱۶	۱۹۲۱
۱۸	۱۹۲۲
۳۱	۱۹۲۳

گزشتہ سورج گرہن کے موقع پر سماترا میں دنیا کے مختلف مقامات سے ہیئت داں اور ماہرین سائنس جمع ہوئے تھے، انگلستان، جرمنی، فرانسی، امریکہ، ہر ملک نے اپنے نمائندے بھیجے، ان لوگوں نے بڑی بڑی دوربینوں کی مدد سے سورج کا مشاہدہ کیا ہے اور گرہن کی حالت میں اس کی رنگین تصویریں بھی لی ہیں، ان تصویروں کی مدد سے اس تحقیق میں مدد ملے گی کہ سورج میں کون کون سی گیسیں پائی جاتی ہیں۔

اب تک تیز ترین رفتار کا قیاس ایک میل فی منٹ لگایا جاتا ہے، اور ہمارے ہندوستان میں عام طور پر پنجاب میل کی رفتار کو نظیر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، لیکن حال میں پولٹزر (Pulitzer) کپ کے لئے

ہوائی جہازوں کا جو مقابلہ ہوا اس میں تیز ترین ہوائی جہاز کی رفتار ۲۵۰ میل فی گھنٹہ تھی، ۱۷ برس پہلے جب ولبر رائٹ (Wilbur-Wright) فضای پرواز کا موجد، ۳۷ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑا تھا تو لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔



اس سال کا ادب کا نوبل پرائز ایک سوئڈی خاتون سگریٹ انڈست Sigrid Undset کو ملا ہے۔ پچھلے سال یہ آئر لینڈ کے مشہور شاعر W.B. Yeats کو، اور اس سے پیشتر ہمارے ہندوستان کے مایہ ناز فلسفی اور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کو ملا تھا۔ اس انعام کی مالیت تقریباً دیر لاکھ روپیہ ہوتی ہے۔



اخبار کلیہ

بہمن کے بعد کا زمانہ ہر کلیہ کی دلچسپیوں اور تفریعوں کے لئے جزر کا زمانہ ہوتا ہے، چنانچہ ہمارے کلیہ میں بھی یہ پچھلے تین ماہ ایسے ہی رہے۔ سوائے مختلف بزموں کے جلسوں کے، اور روزانہ کھیلوں کے، اور کوئی بات خاص طور پر ذکر کے قابل نہیں ہے۔ دسمبر میں جو سالانہ ٹورنامنٹ ہوا کرتا تھا، اس سال حضور منجھلی صاحبزادی صاحبہ مرحومہ و مغفورہ کی وفات حسرت آیات کی وجہ سے ملتوی کر دیا گیا۔

سال درم، عثمانیہ میٹرک، اور سکستھ فارم کے طلباء کے آزمائشی امتحانات ختم ہو چکے ہیں، اور ان کی شرکت کی درخواستیں بھی روانہ ہو چکی ہیں۔ پرنسپل اور مدرسین کی کوششوں کا جہاں تک دخل تھا، وہ ختم ہو گئیں، اور اب صرف طلباء کی اپنی محنت کی ضرورت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے کلیہ کے فوٹبال پچھلے سال کے کارناموں پر نظر رکھیں گے۔ جانے والوں نے ان کے لئے ایک روشن اور قابل تقلید مثال چھوڑی ہے، اس کی تقلید کرنی، اور اسے روشن تر بنانا، یہ انہیں کا کام ہے۔

ہم ان سب قسمت آزمائوں کو الوداع کہتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ جس طرح ان کی اس کلیہ کی زندگی باہمی ربط، محبت اور میل جول میں کٹی، ویسی ہی ان کی آئندہ زندگی بھی ہوگی، ان کی جگہ، اور ان کی یاد ہم سب کے دلوں میں ہے اور ہمیشہ رہیگی۔ ہمیں یہ بھی امید ہے کہ اس چھوٹی سی دنیا سے باہر قدم رکھنے کے بعد وہ اسے بالکل ہی بھول نہ جائیں گے۔ ہم ان کے مضامین اور حالات کو ہمیشہ خوشی کے ساتھ اس رسالہ میں شایع کرتے رہیں گے، اور وہ زندگی کے جس میدان میں بھی ہونگے، ہم سب کی دعائیں ان کے ساتھ رہیں گی۔



خوشی کی بات ہے کہ ہمارا پور فنڈ بدستور اپنا مفید کام کر رہا ہے، اس کا سنہ ۳۳ کا موازنہ ہم کسی پچھلے نمبر میں شایع کر چکے ہیں، اب ذیل میں سنہ ۳۳ ف کی آمد و خرچ کی مدیں دکھاتے ہیں، جن محسنوں نے اس میں حصہ لیا ہے، اور جن ہمدرد معاونین نے اس کی مدد کی ہے، ہم ان سب کا شکریہ ادا کرتے ہیں، اور امید کرتے ہیں، کہ باہمی امداد اور ایثار کا یہ سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہے گا۔



فرو حساب بابتہ سنہ ۱۳۳۳ فصلی

آمد

پائی	آندہ	روپیہ	مدات
	۲	۱	نقد بدست بتاریخ یکم آذر سنہ ۳۳ فصلی
		۱۲۰	عطیہ ذواب رضا یار جنگ بہادر
			اول تعلقدار ضلع
۶	۵	۶۶	عطیہ از بک تپو
	۸	۲۶۷	چندہ اساتذہ صاحبان
۴	۹	۳۸	مزید چندے
۸	۱۳	۱۴۳	وصول از فیس روشنائی و امتحان
۱۱	۸	۳۳	چندہ طلباء کلیہ
	۸	۱	وصول از فروخت کتب
۵	۷	۶۷۳	جملہ آمد
۱۰	۵	۶۱۳	کل خرچ
۷	۶	۶۰	نقد بدست بتاریخ ۳۰ آبان سنہ ۳۳ فصلی

خرچ

پائی	آنه	روپیہ	
		۵۰	سرمایہ و وظیفہ کلیہ
۶	۱۴	۲۹۸	خرید کتب
۴	۹	۱۳۹	وظائف وغیرہ
	۱۴	۱۰۰	خرید روشنائی و کاغذ برائے امتحان
		۲۴	کرایہ ریل چہار طلباء سکستہ فارم
۱۰	۵	۶۱۳	میزان



